Regd. L. No.7243

Phone 880800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اکتوبر 1981

اس پرچہ میں :-

قرآنی آئین کے بنیادی خط و خال

اگلے پرچہ میں :-

بنیادی حقوق انسانیت

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ - لاہور

قیمت فی پرچہ 3 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیّت کا پیامبر

ماہنامہ **طلوعِ اسلام** لاہور

ٹیلی فون
۸۸۰۸۰۰

خط و کتابت
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ ۔ لاہور ۱۱

بدلِ اشتراک
سالانہ
پاکستان ۔/۳۶ روپے
غیر ممالک ۔/۸۶ روپے

قیمت فی پرچہ
۳
تین روپے

جلد ۳۴ | اکتوبر ۱۹۸۱ء | شمارہ ۱۰

فہرست

۱۔ لمعات (آزادی اور غلامی!) ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۲
۲۔ اسلامی! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۰
۳۔ شمعِ خاموش ۔ ۔ ۔ رابطۂ باہمی ۔ ۔ ۔ ایک خوشخبری! ۔ ۔ ۔ ۱۱
۴۔ حقائق و عبر ۔ (۱) آہ! بیچارہ ہندی مسلمان ۔ (۲) "محتسبِ اعلیٰ" ۔ ۔ ۔ ۱۲
(۳) اسلام کیسے بدلتا ہے؟ ۔ (۴) خلیفۃ اللہ فی الارض
۵۔ فہرست معطیان قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی ۔ ۔ ۔ ۱۶
۶۔ الٰہین اثنین (دو خدا) ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۷
۷۔ قرآنی آئین کے بنیادی خط و خال ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۲۵
۸۔ "تصوّف کی حقیقت" ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۴۴
۹۔ "سلیم کے نام" ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۴۵
۱۰۔ طلوعِ اسلام کا مقصد و مسلک ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۴۶
۱۱۔ قرآنی درس کے اعلانات ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۴۸
۱۲۔ جمہوریت یا اسلام؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۴۹

[illegible]

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لمعات

"تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنانا شروع کیا۔ ان کی ماؤں نے تو انہیں آزاد جنا تھا"

{ حضرت عمرؓ — بنام حضرت عمرو ابن عاصؓ }

حضرت عمرؓ نے اس ایک فقرے میں تکریم و تذلیل انسانیت کا سارا مسئلہ واضح کر دیا۔ ہر انسانی بچہ آزاد (فلہٰذا مستوجب شرفِ انسانیت) پیدا ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس کی اپنی نوع ہی کے افراد اسے غلام اور محکوم بنا لیتے ہیں۔ (علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں) یہ "شرف" حضرتِ انسان ہی کو حاصل ہے کہ یہ اپنی نوع کے افراد کا غلام بن جاتا ہے۔ حیوانات میں ایسا نہیں ہوتا۔

ص ۱۵۷

آدم از بے بصری بندگی آدم کرد ! — گوہرے داشت و لے نذر قباد و جم کرد — (پیام مشرق)

یعنی از خوئے غلامی ز سگاں خوار تراست — من ندیدم کہ سگے پیش سگے سر خم کرد ! — (")

جب ہم غلام (یا غلامی) کے الفاظ بولتے ہیں تو ہمارا ذہن عہدِ قدیم کے ایک خاص طبقہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ عصرِ حاضر کا مہذب انسان بڑے فخر سے کہتا ہے کہ ہم نے غلامی (SLAVERY) کو معدوم کر دیا ہے۔ لیکن اس نے درحقیقت جو کیا ہے وہ اتنا ہی ہے کہ اس نے اس مرض کو ایک خاص طبقہ سے نکال کر عالمگیر انسانیت میں پھیلا دیا ہے۔ آج دنیا کا شاید ہی کوئی ایسا انسان ہو جو اپنے آپ کو آزاد محسوس کرتا ہو! اگر کوئی کسی دوسرے فرد کا غلام نہیں تو خود اپنے آپ کا غلام ہے — اور یہ غلامی کی اور بھی زیادہ شدید شکل ہے۔

سوال یہ ہے کہ غلامی یا محکومی کہتے کسے ہیں! عام الفاظ میں کہہ دیا جائے گا کہ کسی دوسرے کے کام کرنے کو غلامی یا محکومی کہتے ہیں۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ انسان مدنی الطبع واقع ہوا ہے اور متمدن معاشرہ میں مختلف لوگ، مختلف کام کرتے ہیں — ڈاکٹر، درزی کے بچے کا علاج کرتا ہے۔ درزی ڈاکٹر کے کپڑے سیتا ہے۔ قرآن کریم اسے تعاون کہہ کر پکارتا ہے۔ (یعنی ایک دوسرے کی مدد کرنا) اور اچھے کاموں میں تعاون کی نہ صرف تاکید کرتا ہے بلکہ حکم دیتا ہے۔ یہ غلامی یا محکومی نہیں۔

آپ اپنے ملازم سے کہتے ہیں کہ باہر صحن میں تین فٹ گہرا گڑھا کھود دو۔ ملازم آپ سے پوچھ نہیں سکتا کہ گڑھا کیوں کھودا جائے گا۔ اس کا مقصد کیا ہے۔ اس کی غایت کیا ہے؟ اگر وہ پوچھے بھی تو آپ اسے یہ کچھ بتانے کے لئے مکلف نہیں۔ مقصد آپ کا ہے اور آپ کے ذہن میں ہے۔ وہ آپ کے مقصد کے بروئے کار لانے کا ذریعہ (INSTRUMENT) ہے، اور بس۔

آپ اپنے لڑکے سے کہتے ہیں کہ بیٹا! میں باہر جا رہا ہوں۔ میں نے ملازم سے گڑھا کھودنے کے لئے کہا ہے۔ تم اپنی نگہداشت میں گڑھا کھدوا لینا! وہ آپ سے پوچھے گا کہ ابا جان! گڑھا کیوں کھدوایا جا رہا ہے۔ اس کا مقصد کیا ہے، اس کی غایت کیا ہے۔ اگر آپ (ایک مستبد نہیں بلکہ) مشفق باپ ہیں تو آپ اسے سب کچھ بتاتے ہیں۔ وہ کسی بات پر اعتراض کرتا ہے تو آپ اس کا جواب دیتے ہیں۔ آپ اسے دلائل سے اس کام کی افادیت اور اہمیت کا قائل کراتے ہیں۔ جب وہ یوں قائل (یعنی آپ سے متفق) ہو جاتا ہے تو پھر آپ کی ہدایت کے مطابق گڑھے کی نگہداشت کرتا ہے۔

آپ کے حکم کی تعمیل، ملازم نے بھی کی ہے اور آپ کے بیٹے نے بھی۔ لیکن دونوں کی تعمیل میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ملازم، اپنی کسی مجبوری کی وجہ سے (جس کے لئے اس نے آپ کی ملازمت اختیار کر رکھی ہے) آپ کے حکم کی تعمیل کرتا ہے۔ آپ کا بیٹا کسی مجبوری کی وجہ سے ایسا نہیں کرتا۔ جب وہ آپ کے دلائل سے قائل ہو کر، اس اسکیم سے متفق ہو گیا تو وہ آپ کے حکم کی تعمیل نہیں کرتا۔ وہ خود اپنے فیصلے پر عمل کرتا ہے۔ یعنی اب اس کے باپ کا حکم اس کا اپنا فیصلہ بن جاتا ہے۔ اور اپنے فیصلے کی تعمیل، نہ محکومی ہے، نہ غلامی۔

لہٰذا جس حکم کو ایسے دلائل و براہین کی تائید کے ساتھ پیش کیا جائے جن سے آپ کا قلب و دماغ مطمئن ہو جائے، تو اس کی تعمیل کسی غیر کے حکم کی اطاعت نہیں۔ خود اپنے فیصلے کی پیروی ہو گی۔ اسے آزادی کہا جائے گا۔ اور جس حکم کو نہ اس طرح دیا جائے نہ اس کی اس طرح تعمیل کی جائے، وہ غلامی اور محکومی ہو گی۔ اس سے انسان، سطحِ انسانیت سے گر کر درجۂ حیوانیت پر پہنچ جاتا ہے۔ سورۂ یٰسین میں ہے: اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَیْدِیْنَآ اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ ۝ وَذَلَّلّٰنٰهَا ..... (۳۶/۷۱-۷۲)۔ کیا یہ لوگ اس پر غور نہیں کرتے کہ ہم نے مویشیوں کو خود پیدا کیا اور پھر انسانوں کو) ان کا مالک بنا دیا۔ یہ ان سے "ذلت آمیز" کام لیتے ہیں۔ اس میں دو نکات غور طلب ہیں۔ ایک تو یہ کہ انسان حیوانات کا تو مالک ہو سکتا ہے، اپنے جیسے کسی انسان کا نہیں۔ اور دوسرے یہ کہ جس انداز سے حیوانات سے کام لیا جاتا ہے، وہ انداز انسانوں کے لئے وجہِ تذلیل ہے۔ حیوانات کے حق میں اسے اس لئے روا رکھا گیا ہے کہ انہیں تکریم و تذلیل کا احساس نہیں۔ انسانوں کو اس درجہ پر لے آنا انہیں انسان سے حیوان بنا دیتا ہے۔ اسی کو غلامی یا محکومی کہتے ہیں۔

اس غلامی اور محکومی کو عصرِ حاضر کے "مہذب" انسان نے نہیں مٹایا۔ اسے چودہ سو سال پہلے صحرائے عرب کے ایک اُمّی (صلعم) نے مٹایا تھا اور اس طرح (قرآن کے الفاظ میں) ان اغلال و سلاسل کو

کاٹ کر پھینک دیا تھا جس میں نوعِ انسان جکڑی ہوئی چلی آرہی تھی، اور ان استخوان شکن سلوں کو اس کے سر سے اتار پھینکا تھا جن کے بوجھ کے نیچے وہ دبی چلی آرہی تھی۔ (۷/۱۵۷)۔ یعنی اس نے انسان کو انسان کی غلامی اور محکومی سے چھڑا دیا تھا۔

اس دور کو اس نے یَوْمَ الدِّیْن کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی وہ دور جس میں الدّین کا نظام قائم ہوا تھا۔ اس کی خصوصیتِ کبریٰ یہ تھی کہ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا ..... (۸۲/۱۹) جس میں کوئی شخص کسی دوسرے شخص پر "حقِ ملکیت" نہیں رکھتا تھا۔ کوئی کسی کا نہ غلام تھا، نہ محکوم۔ نہ محتاج تھا نہ ذلیل!

کہا جائے گا کہ اس نے انسانوں کو انسانوں کی غلامی اور محکومی سے چھڑا دیا لیکن انہیں احکامِ خداوندی کا پابند تو بنا دیا! کیا یہ بھی محکومی نہیں؟ بے شک اس نے احکامِ خداوندی کی دعوت دی، لیکن اس پر بہت کم غور کیا گیا ہے کہ اس نے ان احکام کو کس انداز سے پیش کیا؟ اس نے ان احکام کو محکم دلائل اور قاطع براہین کے ساتھ پیش کیا۔ نوعِ انسان کو دعوت دی کہ وہ ان دلائل کی روشنی میں ان احکام پر غور و فکر کرے، اور اگر وہ ان سے کامل طور پر مطمئن ہو تو انہیں اختیار کرے۔ ورنہ انہیں مسترد کر دے۔ اس نے، اس ضابطۂ احکام کو پکارا ہی برہان کہہ کر ہے۔ ارشاد ہے:۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُم بُرْهَانٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَأَنزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا مُّبِينًا (۴/۱۷۵)

اے نوعِ انسان! تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے برہان آگئی ہے۔ یعنی ہم نے تمہاری طرف ایک ایسی کتاب بھیجی ہے جو خود بھی روشن ہے اور ہر شے کو روشن کر دیتی ہے۔

اس نے کہا کہ رسولوں کو بھیجا ہی اس لئے جاتا تھا کہ لوگوں کو یہ کہنے کی گنجائش نہ رہے کہ ہمیں بات سمجھائی نہیں گئی تھی: رُسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ..... (۴/۱۶۵)۔ "یہ رسول، لوگوں کو واضح طور پر بتاتے تھے کہ ان احکامِ خداوندی کی اطاعت سے تمہیں کس قدر فائدہ ہوگا۔ اور ان کی خلاف ورزی سے تم کس قدر خسارے میں رہو گے۔ اس طرح خدا کی طرف سے اتمامِ حجت ہو جاتی تھی" وہ ایسے دلائل پیش کرتے تھے جو سیدھے دل میں اُتر جاتے تھے۔ فَلِلَّهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ..... (۶/۱۵۰)۔ آپ قرآنِ کریم میں دیکھئے۔ ہر حکم اور ہدایت کے بعد یہ لکھا ملے گا ___ لَعَلَّكُمْ ___ یا ___ لَعَلَّهُمْ ___ یعنی اس حکم پر عمل کرو گے، تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا۔

اس نے کہا کہ خدا نے کتاب کے ساتھ حکمت بھی نازل کی ہے۔ کتاب کے معنی ہیں احکام و قوانین۔ اور حکمت سے مراد ہے ان احکام کی غرض و غایت۔ ان کا مقصود و مطلوب۔ ان کی حکمت (RATIONALE) یعنی خدا نے، ایک مستبد حاکم کی طرح صرف احکام ہی نازل نہیں کئے۔ ایک مشفق طبیب اور معلّم کی طرح یہ بھی بتایا ہے کہ یہ احکام کیوں نازل کئے گئے ہیں۔ ان کے مطابق چلنے سے تمہیں کیا حاصل ہوگا۔

اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہا کہ تم ان احکامات اور ان سے متعلقہ دلائل و براہین پر غور و فکر کرو۔

علم وبصیرت کی روشنی میں انہیں سمجھنے کی کوشش کرو۔ تفکر و تدبر سے کام لو۔ اس کے بعد اگر تم ان کی افادیت اور اہمیت کے متعلق کامل طور پر مطمئن ہو جاؤ تو انہیں تسلیم کر لو۔ اگر مطمئن نہ ہو تو انہیں مسترد کر دو۔ تم پر کسی قسم کا جبر نہیں۔ استبداد نہیں۔ جو لوگ اس ضمن میں بحث میں الجھتے تھے قرآن انہیں ڈانٹتا نہیں تھا۔ ان سے کہتا یہ تھا کہ دھاندلی مت مچاؤ۔ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۲۷/۶۴) اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو اس کی تائید میں دلائل و براہین پیش کرو۔ ہم اپنے دعوے کو بدلائل پیش کرتے ہیں۔ تم اس کی مخالفت کرتے ہو تو دلائل کی رو سے ایسا کرو۔ ہم اپنے احکام کو کسی سے زبردستی نہیں منواتے۔ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ..... (۲/۲۵۶) غلط اور صحیح دونوں راستے تمہارے سامنے ہیں۔ ان میں سے جو نسا راستہ تمہارا جی چاہے اختیار کر لو۔ ہم تمہارے اختیار اور ارادے کو سلب نہیں کرنا چاہتے۔ فیصلہ تمہارا اپنا ہوگا۔ جب رسول اللہ اس پر کبیدہ خاطر ہوتے کہ یہ لوگ تباہی کا راستہ کیوں اختیار کرتے ہیں تو ارشادِ باری تعالیٰ ہوتا: اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝ (۱۰/۹۹) کیا تو انہیں صحیح راستہ اختیار کرنے پر مجبور کرے گا۔ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ..... (۱۰/۹۹) اگر انہیں جبراً صحیح راستے پر چلانا مقصود ہوتا تو ہم انہیں مویشیوں کی طرح پیدا ہی اس طرح کرتے کہ یہ غلط راستہ اختیار ہی نہ کر سکتے۔ لیکن وہ تو غلامی اور محکومی ہوتی۔ آزادی نہ ہوتی۔

حتیٰ کہ خود ان لوگوں سے بھی کہہ دیا کہ اگر تم نے اس دعوت کو دل و دماغ کی رضامندی کے بغیر (کسی وجہ سے) تسلیم کر لیا، تو ہم تمہارا شمار ماننے والوں میں کریں گے ہی نہیں۔ "ماننے والے" تو وہ ہوتے ہیں کہ وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ۝ (۲۵/۷۳) جب ان کے سامنے تمہاری آیات پیش کی جاتی ہیں تو وہ انہیں بھی بہرے اور اندھے بن کر تسلیم نہیں کرتے۔ واضح رہے کہ ماننا یا مسترد کرنا پورے کے پورے قرآن کا ہوگا۔ اگر قرآن کا کوئی ایک حکم بھی ایسا ہے جس پر آپ کا قلب مطمئن نہیں تو آپ کا شمار اس کتاب کے ماننے والوں میں نہیں ہوگا۔

ظاہر ہے کہ جب خدا خود اپنے احکام بھی بلا دلیل و برہان، زبردستی نہیں منواتا، تو وہ اس کی اجازت کب دے سکتا ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان سے اپنے احکام بہ جبر و اکراہ منوائے۔ یہ غلامی ہوگی اور وجہ تذلیلِ انسانیت! اس لئے اس نے واضح طور پر کہہ دیا کہ کسی انسان کو حقِ حکومت حاصل نہیں۔ (یعنی) پہلی بات تو یہ ہے کہ اطاعت صرف احکامِ خداوندی کی کرائی جائے گی۔ اور یہ اطاعت بہ دلائل و براہین ان سے کرائی جائے گی جو اس پر بدل مطمئن ہوں۔ انہی کو جماعتِ مومنین کہا جائے گا۔

اس طرح احکامِ خداوندی کی اطاعت کرنے والوں سے مزید تاکیداً کہا کہ ان احکام کو نافذ کرنے کے طور طریق باہمی مشورہ سے طے کرو۔ مشورہ میں مختلف دلائل سامنے آتے ہیں اور امورِ متعلقہ کے مختلف پہلوؤں پر غور و خوض کیا جاتا ہے۔ مشورہ کا حکم جماعتِ مومنین ہی کو نہیں دیا۔ خود نبی کریم کو بھی اس میں شامل کیا گیا۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کریم نے انسانوں کو جو آزادی عطا فرمائی اس کا ملخّص یہ تھا کہ
(۱) کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ دوسرے انسانوں پر اپنا حکم چلائے۔
(۲) حکم صرف خدا کا چلے گا۔ لیکن وہ بھی ان لوگوں پر جو بدلائل و شواہد ان احکام کی افادیت کے بدل قائل ہوں۔ اس میں کسی قسم کا جبر و اکراہ نہیں ہوگا۔
(۳) اور ان احکام پر عمل درآمد، باہمی مشورہ سے ہوگا۔

قرآن کریم نے انسان کو ایسی آزادی عطا کی۔ اور صدرِ اوّل میں ایسا نظام قائم کیا گیا جس میں اس آزادی پہ ذرا سی بھی آنچ نہ آنے پائی۔

اس کے بعد قرآن اور اس کا نظام تو پسِ پردہ چلا گیا اور مسلمان قوم باقی رہ گئی۔ اس قوم نے غلامی کی ایک ایک شق کو دوبارہ زندہ کیا اور آزادی کو اس اس انداز سے سلب کیا جس نے فرعون اور ہامان اور قارون کی نہ صرف یاد تازہ کرادی بلکہ ان کی ستم کوشیوں اور ایذا رسانیوں کی داستانوں کو ماند کر دیا۔ اور یہ سب کچھ اسلام کے نام پر کیا۔ فرعونی ملوکیت ایسی کہ اگر کسی نے ایسا پوچھنے کی بھی جرأت کر لی کہ اس حکمِ سلطانی کا مقصد کیا ہے، تو کھال کھنچوا دی۔ ہامانی مذہبی پیشوائیت ایسی کہ اگر کسی نے انسانوں کے وضع کردہ قوانینِ شریعت کے متعلق کہہ دیا کہ وہ منشاءِ خداوندی کے مطابق نہیں، تو اسے مرتد قرار دے کر حوالۂ دار و رسن کر دیا۔ قارونی سرمایہ داری ایسی کہ ہر محنت کش ڈرا اور سہما ہوا کہ اگر مالک نے کام سے نکال دیا تو بچوں کو روٹی کہاں سے کھلاؤں گا؟ ہزار برس سے یہ بدنصیب قوم خوف و حزن کے اسی انسانیت سوز ماحول میں حیوانوں سے بھی بدتر زندگی گذار رہی ہے۔ ان حالات میں شرف و تکریمِ آدمیت آزادی و حریت کا نام لینا تو ایک طرف، اس کا دل میں خیال تک لانا بھی جرم قرار پا جاتا ہے۔

اس شوریدہ بخت قوم کی غلامی کی جگر سوزی کا یہی احساس تھا جس پر وہ دیدۂ بینائے قوم، خون کے آنسو روتا رہا۔ اقبالؒ نے غلامی اور محکومی کی انسانیت سوزی کے متعلق اتنا کچھ لکھا ہے کہ وہ ایک دفتر میں بھی نہیں سما سکتا۔ یہاں ہم اس کے صرف دو چار، جہنم زار مقامات پیش کرنے کی جرأت کرتے ہیں۔ "جہنم زار" اس لئے کہ قرآنِ کریم نے جہنم کے داروغہ کو پکارا ہی "مالک" کہہ کر ہے۔ (۴۳/۷۷) جس معاشرہ میں انسانوں پر انسانوں کی حکومت ہو، وہ جہنم نہیں تو پھر کیا جنت ہوگا!

—— (۱) ——

ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ داری کے ہزار سالہ نظام سے اس قوم کی جو حالت ہو چکی ہے، اس کے متعلق وہ "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" میں کہتے ہیں:-

اس میں کیا شک ہے کہ محکم ہے یہ ابلیسی نظام — پختہ تر اس سے ہوئے خوئے غلامی میں عوام
ہے ازل سے ان غریبوں کے مقدر میں سجود — ان کی فطرت کا تقاضا ہے نمازِ بے قیام!
آرزو اوّل تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں! — ہو کہیں پیدا تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام
یہ ہماری سعیِ پیہم کی کرامت ہے کہ آج — صوفی و مُلّا ملوکیت کے بندے ہیں تمام

(ارمغانِ حجاز صفحہ ۲۱۲)

وہ کہتے ہیں کہ ایسی قوم کے افراد کی ذلت آمیز زندگی تو ایک طرف، اس کی میت کو لحد میں اتارا جائے تو قبر کی مٹی چیخ اٹھتی ہے:۔

آہ ظالم! تو جہاں میں بندۂ محکوم تھا — میں نہ سمجھی تھی کہ ہے کیوں خاک میری سوزناک!
تیری میت سے مری تاریکیاں تاریک تر — تیری میت سے زمیں کا پردۂ ناموس چاک!
الحذر، محکوم کی میت سے سو بار الحذر — اے سرافیل! اے خدائے کائنات! اے جانِ پاک! (ص ۲۳۷)

اور اس کے بعد وہ نظم جس کا عنوان ہے —— دوزخی کی مناجات۔

اس دیرِ کہن میں ہیں غرض مند پجاری — رنجیدہ بتوں سے ہوں تو کرتے ہیں خدا یاد!
پوجا بھی ہے بے سود، نمازیں بھی ہیں بے سود — قسمت ہے غریبوں کی وہی نالہ و فریاد!
ہیں گرچہ بلندی میں عمارات فلک بوس — ہر شہر حقیقت میں ہے ویرانۂ آباد! (ص ۲۴۲)

ضربِ کلیم میں آزاد اور محکوم کا تقابل ان الفاظ میں کرایا گیا ہے:۔

آزاد کی اک آن ہے، محکوم کا اک سال — کس درجہ گراں سیر ہیں محکوم کے اوقات
آزاد کا ہر لحظہ پیامِ ابدیت — محکوم کا ہر لحظہ نئی مرگِ مفاجات!
آزاد کا اندیشہ حقیقت سے منوّر — محکوم کا اندیشہ گرفتارِ خرافات!
محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا — ہے بندۂ آزاد خود اک زندہ کرامات (ص ۸۷)

ضربِ کلیم ہی میں "نفسیاتِ غلامی" کے عنوان سے دو نظمیں ہیں۔ ایک میں کہتے ہیں:۔

سخت باریک ہیں امراضِ اُمم کے اسباب — کھول کر کہیے تو کرتا ہے بیاں کوتاہی
دینِ شیری میں غلاموں کے امام اور شیوخ — دیکھتے ہیں فقط اک فلسفۂ روباہی!
ہو اگر قوّتِ فرعون کی درپردہ مرید — قوم کے حق میں ہے لعنت وہ کلیم اللّٰہی! (ص ۱۶۱)

دوسری نظم کا موضوع بھی اس سے ملتا جلتا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

شاعر بھی ہیں پیدا، علما و حکما بھی! — خالی نہیں قوموں کی غلامی کا زمانہ!
مقصد ہے اِن اللہ کے بندوں کا مگر ایک — ہر ایک ہے گو شرحِ معانی میں یگانہ
بہتر ہے کہ شیروں کو سکھا دیں رمِ آہو — باقی نہ رہے شیر کی شیری کا فسانہ!
کرتے ہیں غلاموں کو غلامی پہ رضا مند — تاویلِ مسائل کو بناتے ہیں بہانہ! (ص ۱۴۲)

قوموں کی تقدیر ان کی ابھرنے والی نسل کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ ان میں کا ہر فرد، ملّت کے مقدر کا ستارہ ہوتا ہے۔ قوم کو ابدی غلامی پر مطمئن رکھنے کا بہترین طریق یہ ہے کہ اس کی نوجوان نسل کو تعلیم اس انداز سے دی جائے کہ وہ ابھرے ہی غلام بن کر۔ ضربِ کلیم میں "نصیحت" کے عنوان سے یہ نسخہ عام کیا گیا ہے کہ:۔

اک مردِ فرنگی نے کہا اپنے پسر سے؎ — منظر وہ طلب کر کہ تری آنکھ نہ ہو سیر!

؎ بات تو یہ مردِ فرنگی نے تقسیمِ ہند سے پہلے کہی تھی لیکن ہم پر یہ آج بھی اسی طرح صادر آتی ہے کیونکہ ہمارا نظامِ تعلیم وہی ہے۔

بیچارے کے حق میں ہے یہی سب سے بڑا ظلم　　بڑے پہ اگر فاش کریں قاعدۂ شیر!
سینے ہی میں رہے رازِ ملوکانہ تو بہتر!　　کرتے نہیں محکوم کو تیغوں سے کبھی زیر
تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو　　ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر!
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب　　سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر!　　(صفحہ ۵۶)

صفحہ ۱۶۲ پر ایک نظم ہے جس کا عنوان ہے ——— غلاموں کی نماز۔ (ترکی وفد ہلالِ احمر لاہور میں)۔ کہتے ہیں :-

کہا مجاہدِ ترکی نے مجھ سے بعدِ نماز　　طویل سجدہ ہیں کیوں اس قدر تمہارے امام؟
وہ سادہ مردِ مجاہد، وہ مومنِ آزاد　　خبر نہ تھی اسے کیا چیز ہے نمازِ غلام؟
ہزار کام ہیں مردانِ حُر کو دنیا میں　　انہیں کے ذوقِ عمل سے ہیں اُمتوں کے نظام
بدن غلام کا سوزِ عمل سے ہے محروم　　کہ ہے مرورِ غلاموں کے روز و شب پہ حرام
طویل سجدہ اگر ہیں تو کیا تعجب ہے　　ورائے سجدہ غریبوں کو اور ہے کیا کام!

خدا نصیب کرے ہند کے اماموں کو!
وہ سجدہ جس میں ہے ملّت کی زندگی کا پیام

———(۰)———

زبورِ عجم کے آخری باب کا تو عنوان ہی "بندگی نامہ" یعنی غلامی و محکومی ہے۔ جی تو چاہتا تھا کہ وہ سارے کا سارا باب یہاں نقل کر دیا جائے لیکن ایک تو عدمِ گنجائش اس کی مانع ہے، اور دوسرے یہ کہ وہ اشعار فارسی میں ہیں، اور ہم جب بھی فارسی کا کوئی شعر درج کرتے ہیں تو تقاضے موصول ہوتے ہیں کہ ایسے اشعار کا اُردو ترجمہ ساتھ دیا جانا چاہیئے! شعر اور اس کا ترجمہ؟ اس کے متعلق اس سے زیادہ کیا عرض کیا جائے کہ :-

کسے نہ بائے کوئی خونِ آرزو کیا ہے!　　انہیں یہ ضد ہے کہ دیکھیں گے رنگ و بو کیا ہے!

ہم اپنے محترم قارئین کی شکایتِ رنجگیں کو تو برداشت کر لیں گے، اشعار کا ترجمہ کر کے، روحِ اقبالؒ سے شرمندہ ہونے کی تاب نہ لا سکیں گے۔

بندگی نامہ کے چند ایک اشعار ملاحظہ فرمایئے :-

از غلامی دل بمیرد در بدن　　از غلامی روح گردد، بار تن
از غلامی بزمِ ملّت فرد فرد　　این و آں، با این و آں اندر نبرد
آں یکے اندر سجود، این در قیام　　کاروبارش چوں صلوٰۃ بے امام
در فتد هر فرد با فرد دگر　　هر زمان هر فرد را دردِ دگر
آبروئے زندگی در باختہ　　چوں خراں باکاہ و جو در ساختہ　　(صفحہ ۲۴۶)

———(۰)———

در غلامی تن ز جاں گردد تہی　　از تنِ بے جاں چہ امید بہی!

جبرا میلے اگر سازی غلام ــ بر فتد از گنبد آئینہ فام
کیشِ او تقلید و کاوش آذری ست ــ ندرت اندر مذہبِ او کافری ست
تازگیہا وہم و شک اختر اندش ــ کہنہ و فرسودہ خوش می آیدش
چشمِ او بیرفتہ، از آئندہ کور ــ چوں مجاور، رزقِ او از خاکِ گور (صفحہ ۲۵۷)

(۰)

دین و دانش را غلام ارزاں دہد ــ تا بدن را زندہ دارد، جاں دہد
گرچہ برلب ہائے او نامِ خداست ــ قبلۂ او طاقتِ فرماں رواست
طاقتے، نامش دروغِ با فروغ ــ از بطونِ او نزاید جز دروغ
ایں صنم تا سجدہ اش کردی خداست ــ چوں یکے اندر قیام آئی فناست
آں خدا، نانے دہد، جانے دہد ــ ایں خدا جانے برد، نانے دہد
آں خدا در جانِ آزاد و فراق ــ ایں خدا اندر کلامِ او نفاق! (صفحہ ۲۵۸)

(۰)

اور آخر میں:

از غلامے ذوقِ دیدارے مجو ــ از غلامے جانِ بیدارے مجو
دیدۂ او منتِ دیدن نبرد! ــ درجہان خورد و گراں خوابید و مُرد
حکمراں بکشایدش بندے اگر ــ می نہد بر جانِ او بندے دگر
سازد آئینے گرہ اندر گرہ! ــ گویدش می پوش ازیں آئیں زرہ
تا غلام از خویش گردد نا امید ــ آرزو از سینہ گردد ناپدید!
گاہ او را خلعتِ زیبا دہد ــ ہم زمامِ کار در دستش نہد! ق
نعمتِ امروز را شیدا اش کرد ــ تا بمعنی منکرِ فرداش کرد (صفحہ ۲۶۱)

یہ ہے جو کچھ حکمران، غلاموں اور محکوموں کے ساتھ کرتا ہے۔

قرآنِ کریم نے انسانوں کو جو عِبادُ اللہ کہا ہے تو اس میں ایک باریک رمز مضمر ہے۔ جب غلامی کا عام رواج تھا تو بین الاقوامی دستور یہ تھا کہ کوئی شخص دوسرے کے غلام کو اپنا غلام نہیں بنا سکتا تھا۔ جو انسان خدا کا عبد بن جائے تو، اس دستور کی رُو سے، کوئی انسان اسے اپنا عبد (غلام) نہیں بنا سکتا۔ لیکن جب وہ اس کا عبد نہ رہے تو پھر وہ سرِ نیلام گاہ میں پہنچایا جاتا ہے کہ جو زیادہ بولی دے، لے جائے۔ افراد کے ساتھ بھی یہی ہوتا ہے اور اقوام کے ساتھ بھی یہی۔ بقول اقبالؒ:

یہ بندگی خدائی، وہ بندگی گدائی
یا بندۂ خدا بن، یا بندۂ زمانہ!

(۰)

اِسلامی

- پاکستان کا اسلام کے نام پر حاصل کیا جانا کیا معنی رکھتا ہے، کہ یہاں کی ہر چیز خود بخود اسلامی ہو گئی جس طرح مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہو جانے والا بچہ خود بخود مسلمان ہو جاتا ہے۔
- اسلامی مملکت۔ اسلامی جمہوریہ۔ اسلامی نظام۔ اسلامی آئین۔ اسلامی قوانین۔ اسلامی مکاتب، اسلامی دارالعلوم۔ اسلامی یونیورسٹی۔ اسلامی فیکلٹی۔ حتیٰ کہ اسلامی طب!
- یہاں (یعنی تمام مسلمان ممالک میں بسنے والے) مختلف فرقوں کا اسلام الگ الگ ہے۔ اسلامی قوانین شریعت الگ الگ ہیں۔ نمازیں الگ الگ ہیں۔ امام الگ الگ ہیں۔ لیکن اس کے باوجود سب اسلام کے پابند ہیں! سب فرقے اسلامی ہیں۔ سب کی شریعتیں اسلامی ہیں۔ سب کی نمازیں اسلامی ہیں۔
- ان سے پوچھئے کہ اسلام کیا ہے، تو ہر ایک کا جواب ایک ہی ہو گا۔ یعنی خدا اور رسولؐ کی اطاعت۔ کتاب و سنت کی پیروی۔ گویا خدا اور رسولؐ ہر ایک کو الگ الگ احکام دیتے ہیں اور کتاب و سنت جداگانہ پیروی کی تاکید کرتی ہے؟
- پاکستان میں بحمدہٖ احیاء اسلام کا عمل جاری ہوا ہے۔ طے یہ ہوا ہے کہ اسلام نام ہے کتاب و سنت کے مطابق قوانین سازی کا۔ اس سلسلہ میں اب تک جو متفرق نافذ ہوئی ہیں ان کی رو سے:۔

(۱) خود آئین میں یہ شق داخل کر دی گئی ہے کہ جہاں تک شخصی قوانین کا تعلق ہے، ہر فرقہ کی کتاب و سنت کی تعبیر اپنی اپنی ہو گی۔

(۲) ادائیگی زکوٰۃ کا حکم مرکزی حکومت نے جاری کیا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ جو شخص ان احکام کی رو سے زکوٰۃ ادا نہ کرنا چاہے وہ اپنے فرقہ کی مسلمہ فقہ کی پابندی کر سکتا ہے۔

(۳) حدود (سزاؤں) سے متعلق احکام کی جزئیات خدا کی مقرر فرمودہ نہیں، عباسیوں کے دورِ ملوکیت کے ماہرینِ قوانین کی مرتب کردہ ہیں جنہیں اسلامی کہہ کر نافذ کیا گیا ہے۔

(۴) حدود میں یہ طے نہیں پا سکا کہ رجم کی سزا کتاب و سنت کے مطابق ہے یا نہیں۔

شمع خاموش!

پرویز صاحب کے ہفتہ واری درسِ قرآن کے حلقۂ خواتین میں ایک ایسی پُر وقار نشست خالی ہو گئی ہے جس کا پُر ہونا بہت مشکل ہے ——— نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام، لاہور، پروفیسر خالد سلام کی والدہ محترمہ بیگم سکندر اسلام، مرحوم ہو گئیں۔ کم و بیش چالیس سال سے، قرآنی فکر سے اس طرح وابستہ کہ نہ صرف اسے اپنے قلب و دماغ میں جذب کرتیں، بلکہ نہایت جرأت و بے باکی سے اسے آگے بھی پھیلاتیں۔ ان کا یہ سلسلہ لاہور اور کراچی، دونوں جگہ جاری رہتا کیونکہ ان دونوں شہروں میں وہ یکے بعد دیگرے قیام پذیر ہوتیں۔ اب یہ دونوں محفلیں اس سے محروم ہو گئیں۔ دعا ہے، اللہ تعالیٰ مرحومہ کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل کی توفیق۔

——— (۰) ———

رابطۂ باہمی

محترم ماسٹر غلام حسین صاحب کی مساعی جمیلہ سے چکوال میں بزمِ طلوعِ اسلام کا قیام عمل میں آیا ہے ——— اراکینِ بزم نے، ماسٹر صاحب ہی کو اپنا نمائندہ منتخب کیا ہے۔ ہم ماسٹر صاحب کو اس بزم کے قیام اور اراکینِ بزم کو، نمائندگی کے لئے ان کے حسنِ انتخاب پر مستحقِ مبارکباد قرار دیتے ہوئے، بزم کے قیام کی تصویب اور نمائندہ کے انتخاب کی توثیق کرتے ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان احباب کو فکرِ قرآنی کی نشر و اشاعت کی بیش از بیش توفیق عطا فرمائے۔

نمائندہ بزم کا پتہ یہ ہے:-

محترم، ماسٹر غلام حسین صاحب۔ ضیا ٹیوشن سنٹر، نزد ہجویری مسجد محلہ تحصیل آفس۔ چکوال

——— (۰) ———

ایک خوشخبری

بِللّٰہِ الحمد کہ، مطالب الفرقان کی چوتھی جلد۔ بحسن و خوبی مرتب ہو کر پریس جا رہی ہے۔ مطالب الفرقان کی پہلی تین جلدیں صرف سورۃ البقرہ کو اپنے اندر سمو سکی تھیں۔ یہ چوتھی جلد سورۃ آلِ عمران۔ سورۃ النساء اور سورۃ المائدہ پر مشتمل ہے۔ اور تقریباً ۶۵۰ صفحات کو محیط۔ امید ہے کہ ہم، طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت نومبر ۱۹۸۱ء میں، اس کی متعین تاریخ اشاعت کے اعلان کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔ ایسی ضخیم کتابوں کی طباعت کے لئے پریس کافی وقت لے لیتا ہے۔

پرویز صاحب کے لئے ہم اس سے بڑھ کر اور کیا دعا مانگ سکتے ہیں کہ ـــ تیرے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے ـ دعائیں تو آپ جانتے ہیں "خود غرضی" شامل ہوتی ہے۔

(ناظم ادارہ طلوعِ اسلام لاہور)

حقائق و عبر

۱- آہ! بیچارہ، ہندی مسلمان

طلوع اسلام بابت ستمبر ۱۹۸۱ء میں بتایا جا چکا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں پر کسطرح گوشۂ عافیت تنگ کیا جا رہا ہے اور ان سے کہا جا رہا ہے کہ اگر انہوں نے ہندوستان میں رہنا ہے تو اس کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ وہ ہندو مذہب اختیار کر لیں۔ دو دیا کھیان کر پلانی صاحب کا تھا۔ معاصر ایشیا کی ۱۶ اگست ۱۹۸۱ء کی اشاعت میں ہندوؤں کے بعض دیگر لیڈروں کے بیانات کے کچھ اقتباس شائع ہوئے ہیں جو وہاں کی عام ہندو ذہنیت پر مزید روشنی ڈالتے ہیں۔

مسٹر بلراج مدھوک (کالعدم) آر۔ ایس۔ ایس کے صدر ہیں۔ فرماتے ہیں۔

اس امر کے باوجود کہ مسلمانوں نے تقسیم ہند کے لئے دل و جان سے کوشش کی اور اب ان کا ہندوستان میں رہنے کا کوئی اخلاقی جواز نہیں ہے پھر بھی اگر وہ برابری کے سلوک کے خواہش مند ہیں تو انہیں یکساں رسول کو ڈھول کر لینا چاہیئے یعنی شادی بیاہ اور سماجی زندگی میں مذہب کی اڑچن نہیں لگانی چاہیئے۔ ہندوستان میں آباد تمام باشندوں کو صحیح معنوں میں ہندوستانی ہو کر رہنا چاہیئے۔ اور حدود ہندوستان سے باہر کسی سے اظہار وفاداری نہیں کرنا چاہیئے انہیں اپنی ترجیحات کو بدلنا ہوگا یعنی ان کی وفاداریاں ہر حال میں ملک و قوم کے ساتھ ہوں۔

آگے چل کر یہی صاحب کہتے ہیں۔

شاید ہی کوئی مسلمان ہو جس نے تقسیم اور پاکستان کے حق میں ووٹ نہ دیا ہو، اب اگر وہ ہندوستان میں توطن پذیر ہونا چاہتے ہیں تو انہیں اعلانیہ طور پر دو قومی نظریئے سے اظہار برئیت کرنا چاہیئے۔ افسوس کہ ان میں علیحدگی پسندی اب تک باقی ہے۔

آر۔ ایس۔ ایس ہی کے ایک اور لیڈر، ڈاکٹر گول والکر نے اپنی کتاب "ہندو دھارا شٹر کیوں" میں لکھا تھا۔

مسلمانوں کی حیثیت درحقیقت چور کی ہے جو ہمارے گھر میں گھس آئے تھے ..... ہماری بدنصیبی ہے کہ ہمارے دستور میں فرزندانِ زمین اور جارحین (یعنی مسلمان) کو یکساں درجہ دے دیا گیا ہے۔ یہ صورت ایسی ہی ہے جیسے کوئی شخص اپنے گھر میں گھس آنے والے چور اور اپنے بچوں کو یکساں درجہ دے دے۔

اور جن سنگھ کے سیکرٹری جنرل، دین دیال اوپادھیائے تو تشکیل پاکستان کے جلد ہی بعد لکھا تھا۔

نظریہ ہندو مت کے سوا کچھ نہیں۔ یہ صرف ہندو مت ہے جو بھارت کو متحد رکھ سکتا ہے ..... اگر مسلمان کو اس

ملک میں رہنا ہے تو ہندو بن کر رہیں، ..... انہیں ختنہ بھی ترک کرنا ہوگا۔

قائدِ اعظمؒ کا خیال کس قدر صحیح تھا کہ اس مسئلہ کا حل ہندوستان اور پاکستان کے درمیان حکومتی سطح پر تبادلۂ آبادی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔

اب ہندوستان میں ہریجنوں کے قبولِ اسلام کی ایک لہر اٹھی ہے۔ معلوم نہیں اس کے ردِ عمل کے طور پر ہندو ذہنیت کیا روش اختیار کرے گی۔

اے کاش! دنیا کے ایک ارب کے قریب مسلمان ایک زندہ قوم ہوتے۔

۲۔ محتسبِ اعلیٰ

مملکتِ پاکستان میں ایک محتسبِ اعلیٰ کے تقرر کی تجویز آجکل زیرِ غور ہے۔ بدقسمتی سے اُس تجویز کا مسودہ ہماری نظروں سے نہیں گذرا۔ لیکن دو ایک تبصرے ایسے سامنے آئے ہیں جن سے حقیقت کچھ کچھ واضح ہو جاتی ہے۔ (مثلاً) صوبائی وزیرِ قانون چودھری عبدالغفور صاحب نے اخبار نویسوں سے باتیں کرتے ہوئے فرمایا کہ

> اسی قسم کے ادارے پولیس میں کرائمز برانچ اور سپیشل پولیس کے نام پر قائم کئے گئے تھے تاکہ وہ بغیر کسی اثر کے تفتیش کے بعد جرائم کی بیخ کنی کر سکیں۔ مگر دیکھا گیا ہے کہ متذکرہ دونوں اداروں میں اثر و رسوخ کام کر جاتا ہے۔ مگر محتسبِ اعلیٰ ایک ایسا ادارہ ہوگا جو بغیر کسی دباؤ کے یہ دیکھے گا کہ قوانین پر عملدرآمد نہیں ہو رہا، اور کون سے عناصر اس میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ (نوائے وقت۔ لاہور۔ ۱۲۔ اگست ۱۹۸۱ء)

وزیرِ محترم نے یہ نہیں بتایا کہ یہ نیا ادارہ اثر اور دباؤ سے محفوظ کس طرح رہے گا؟ اس کے متعلق ایک تجویز میر عبدالباقی بلوچ صاحب کے قلم سے نوائے وقت کی اشاعت بابت ۳ ستمبر ۱۹۸۱ء میں شائع ہوئی ہے جو خصوصی توجہ کی مستحق ہے۔ وہ فرماتے ہیں:-

> اس کی سربراہی کسی بڑے عالمِ دین کو سونپی جائے جس طرح کچھ علمائے دین کو سپریم کورٹ کا جج مقرر کیا گیا ہے اسطرح اُن میں سے کسی کو پاکستان کا "محتسب" مقرر کیا جائے اور اس کو یہ بھی اختیار دیا جائے کہ وہ اپنے قواعد و ضوابط مرتب کرکے اپنے لئے عملہ منتخب کرے اور اس عملے کے ارکان دینی مدارس یا دارالعلوم کے سند یافتہ ہونے چاہئیں
>
> (بلوچ صاحب نے یہ بھی تجویز کیا ہے کہ اس عملے کی مدد اور معاونت کے لئے علاقائی منتخب لوکل کونسلوں میں سے کچھ کو شریک کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ اسلام کیسے بدلتا ہے؟

کالعدم جماعتِ اسلامی کے سابقہ امیر میاں طفیل محمد صاحب نے اگلے دنوں

> (محترم) صدر ضیاء الحق کو مشورہ دیا کہ وہ یا تو خود پارٹی بنائیں یا ایسی پارٹی کو ساتھ ملالیں جو اسلام کو نافذ کرنے کی خواہش مند ہو اور ملک دشمن عناصر کی سرگرمیوں کا نوٹس لے۔ (نوائے وقت بابت ۱۸ اگست ۱۹۸۱ء)

ہمیں اس خبر پر تبصرہ مقصود نہیں۔ ہم کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ ان حضرات کے ہاں اسلام بدلتا کیسے ہے۔

جب سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) ۱۹۳۷ء میں پنجاب تشریف لائے تو اُن کی حیثیت ایک صحافی کی تھی، اور ان کی اپنی پارٹی کوئی نہیں تھی اگرچہ ملک میں بڑی بڑی پارٹیاں مثل مسلم لیگ اور خاکسار وغیرہ بڑے عروج پر تھیں۔ مودودی (مرحوم) نے ارشاد فرمایا کہ اسلام میں الگ الگ پارٹیاں بنانا قطعاً جائز نہیں۔ چنانچہ انہوں نے رسالہ پیغام حق کی فروری ۱۹۳۸ء کی اشاعت میں ایک طویل مقالہ سپرد قلم فرمایا جس میں لکھا:

> یہ قوم تو پہلے ہی ایک جمعیت ہے۔ اس جمعیت کے اندر کوئی الگ جمعیت الگ نام سے بنانا اور مسلمان اور مسلمان کے درمیان کسی وردی یا ظاہری علامت یا کسی خاص نام یا کسی خاص مسلک سے فرق و امتیاز پیدا کرنا اور مسلمانوں کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کر کے ان کے اندر جماعتیں اور فرقوں کی عصبیتیں پیدا کرنا اور اصل مسلمانوں کو مضبوط کرنا نہیں بلکہ ان کو اور کمزور کرنا ہے۔ یہ تنظیم نہیں، تفرقہ پردازی اور گروہ بندی ہے۔ لوگوں نے آنکھیں بند کر کے جمعیت سازی کے یہ طریقے اہل مغرب سے لئے ہیں مگر ان کو معلوم نہیں کہ جو چیزیں دوسروں کے مزاج کو موافق آتی ہیں، وہ مسلمانوں کے مزاج کو موافق نہیں آتیں۔

اُس وقت یہ اسلام تھا۔ اُس کے تین ہی برس بعد انہوں نے خود اپنی الگ پارٹی قائم کی، اور اس کا نام جماعت اسلامی رکھا وہ جماعت اب تک قائم (سردست کالعدم) ہے۔ آجکل ملک میں سیاسی پارٹیوں کے خلاف کوئی آواز اٹھتی ہے تو اس کی سب سے زیادہ شدید مخالفت انہی کی طرف سے ہوتی ہے۔ اور اب محترم میاں صاحب، صدر مملکت کو بھی مشورہ دے رہے ہیں کہ وہ یا تو خود اپنی پارٹی تشکیل کریں، اور یا (دبے لفظوں میں) اُن کی پارٹی میں شامل ہو جائیں۔

۴۔ خلیفۃ اللہ فی الارض

ہمارے ہاں قدیم سے یہ عقیدہ چلا آرہا ہے کہ انسان زمین پر خدا کا خلیفہ ہے۔ پرویز صاحب نے بہت پہلے اس خلافِ قرآن عقیدہ کی تردید کی تو اُن کے خلاف مخالفت کا طوفان اُٹھ کھڑا ہوا کہ یہ ایسے عقیدے کی تردید کر رہے ہیں جو اسلاف میں متفق علیہ اور امت میں متواتر چلا آرہا ہے۔

جب شروع شروع میں آئین پاکستان کا مسودہ مرتب ہوا، تو اس میں کہا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اختیارات مسلمانانِ پاکستان کو تفویض کر دیئے ہیں۔ طلوع اسلام نے اس کی بھی شدت سے مخالفت کی لیکن علماء کرام نے حسب معمول طلوع اسلام کو ہدف طعن و تشنیع قرار دیا۔ مقام شکر ہے کہ اب یہ حضرات رفتہ رفتہ انہی خیالات کی طرف آرہے ہیں جو طلوع اسلام میں پیش کئے گئے تھے۔

ماہنامہ محدث (لاہور) کی جولائی۔ اگست ۱۹۸۱ء کی اشاعت میں اُس کے مدیر اعلیٰ حافظ عبدالرحمٰن مدنی صاحب کا ایک انٹرویو شائع ہوا ہے جو ہفت روزہ بادبان (لاہور) کے نمائندہ میاں شعیب الرحمٰن صاحب نے لیا تھا۔ اس کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔

شعیب الرحمٰن: اسلامی جمہوریت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اختیارات حکومت

سوسائٹی کو سونپ دیئے ہیں یعنی اصل اختیار و اقتدار تو اللہ ہی کا ہے انسانوں کو یہ اختیار خدا کا تفویض کردہ ہے۔
اس وضاحت کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

حافظ صاحب: دراصل یہ توجیہہ دنیا میں انسان کے خلیفۂ الٰہی ہونے کے تصور سے پیدا ہوئی ہے حالانکہ یہ تصور ہمارے اسلاف میں بہت ناپسند کیا گیا ہے امام ابن تیمیہؒ تو ایسا عقیدہ رکھنے والے کو کافر اور مشرک کہتے ہیں۔ **من اعتقد ان الانسان خلیفۃ اللہ فقد کفر**۔ علامہ ماوردی احکام السلطانیہ میں جمہور علماء سے ایسے شخص کے بارے میں فاسق و فاجر ہونے کی رائے نقل کرتے ہیں کیونکہ اگر انسان کو خدا کا خلیفہ بنا کر وہی اختیار و اقتدار اسے تفویض کر دیا جائے تو انسان خود مطاع بن جاتا ہے (خواہ اختیار مفوضہ کا حامل ہی کیوں نہ ہو) حالانکہ عام انسان تو کجا نبی بھی مطاع مطلق اللہ جل شانہ کی اطاعت کرانے کے لئے آتا ہے۔ اسی حیثیت سے وہ اللہ کا نمائندہ "رسول" ہوتا ہے، خلیفہ نہیں۔ اگر "نائب" اور "نمائندے" کے فرق پر غور کر لیا جائے تو بات واضح ہو جاتی ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کا یہ فرمان اسلامی فکر کی اچھی تعبیر ہے کسی نے آپ کو خلیفۃ اللہ کہہ کر پکارا تو آپ نے جواب دیا:-

"**لست خلیفۃ اللہ بل انا خلیفۃ رسول اللہ**"

میں اللہ کا خلیفہ نہیں۔ میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ ہوں۔

جدید علم سیاست کی رُو سے بھی حاکمیت کا یہ خاصہ ہے کہ وہ کسی کو تفویض نہیں ہوتی یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی حکمران اپنے قول و فعل کی یہ حیثیت مقرر کر دے کہ اس پر کوئی فرد یا ادارہ نظر ثانی نہ کر سکے تو گویا اُس نے خدا ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ کیونکہ بالاترین ہونا اللہ کی صفت ہے۔ قرآن کریم میں ہے: "**لا یسئل عما یفعل وھم یسئلون**" اللہ تعالیٰ کو کسی فعل پر باز پرس نہیں جبکہ باقی سب کا محاسبہ ہوگا۔ یہی چیز اسلام کو ملوکیت یا آمریت سے ممتاز کرتی ہے۔

شعیب الرحمٰن: کیا قرآن مجید میں انسان کو اللہ کا خلیفہ نہیں کہا گیا؟ آپ "انی جاعل فی الارض خلیفۃ" کا کیا جواب دیں گے؟

حافظ صاحب: سب سے پہلے ابن عربی نے ہمہ اوست کے نظریہ کی تفصیلات میں یہ فکر پیش کیا تھا جو بعد میں بعض دیگر علماء نے بھی اختیار کر لیا حالانکہ کتاب و سنت میں کہیں بھی اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی نسبت سے خلیفہ نہیں کہا۔ اس آیت میں بھی خلیفہ کی اضافت اللہ کی طرف نہیں بلکہ یہ جنسِ آدم کی ایک صفت ہے کہ نوعِ بنی آدم میں خلافت کا نظام قائم ہوگا۔

فہرست معطیان قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی

(۲۰ جولائی تا ۲۱ ستمبر ۱۹۸۱ء)

اسمائے گرامی	رقم	رسید نمبر
محترم	روپے	
۱۔ ملک محمد انور صاحب چک ۱۹۲ (فیصل آباد)	۱۰۰/-	۳۹۵۵/۱۲۹
۲۔ سید امیر حسین شاہ صاحب، سید حسین (جہلم)	۱۰۰۰/-	۳۹۵۶
۳۔ محترمہ مسز ظفر سعید صاحبہ۔ سیالکوٹ	۳۰۰/-	۳۹۵۷
۴۔ مسز زیڈ مشرف صاحبہ۔ اسلام آباد	۱۰۰/-	۳۹۵۸
۵۔ غلام رضا صاحب۔ لودھراں	۱۰۰/-	۳۹۵۹
۶۔ محترمہ سلیمہ اختر صاحبہ۔ ″	۳۰/-	۳۹۶۰
۷۔ رانا اختر علی صاحب ″	۲۵/-	۳۹۶۱
۸۔ رانا لیاقت علی صاحب ″	۱۰/-	۳۹۶۲
۹۔ محمد حامد سلیم صاحب ″	۱۰/-	۳۹۶۳
۱۰۔ غلام حسین خان صاحب ″	۱۵/-	۳۹۶۴
۱۱۔ محترمہ انجم رضا صاحبہ معرفت بیگم قریشی صاحبہ گلبرگ۔ لاہور	۱۵۰۰/-	۳۹۶۵
۱۲۔ محمد ارشاد صاحب ٹیچر۔ چاہدان۔ مری	۲۵/-	۳۹۶۶
۱۳۔ حافظ محمد یعقوب صاحب۔ لاہور	۵۰/-	۳۹۶۷
۱۴۔ عبدالاحد صاحب۔ زیدہ بی (مردان)	۱۰۰۰/-	۳۹۶۸
۱۵۔ محترمہ بیگم م۔ ح۔ صاحبہ۔ کراچی ۱۸	۵۰/-	۳۹۶۹
۱۶۔ رفیق الحسن ایاز صاحب۔ قادر آباد۔ معرفت بزم طلوع اسلام۔ گجرات	۵۰/-	۳۹۷۰
۱۷۔ محمود الحسن رازی صاحب لندن معرفت بزم طلوع اسلام۔ لندن	۳۹۲/-	۳۹۷۱
۱۸۔ محمد جان صاحب معرفت محمد صدیق صاحب۔ کویت	۱۰۴۲/-	۳۹۷۲

اسمائے گرامی	رقم	رسید نمبر
محترم	روپے	
۱۹۔ ڈاکٹر بشیر الحق صاحب۔ میر پہاڑی	۲۰/-	۳۹۷۳
۲۰۔ حافظ محمد یعقوب صاحب۔ لاہور	۵۰/-	۳۹۷۴
۲۱۔ محترمہ مسز ظفر سعید صاحبہ۔ سیالکوٹ	۳۰۰/-	۳۹۷۵
۲۲۔ شیخ الطاف حسین ایڈووکیٹ۔ معرفت بزم طلوع اسلام۔ راولپنڈی	۵۰۰/-	۳۹۷۶/۱۳۰
۲۳۔ محترمہ لیڈی ڈاکٹر مس ایچ یاور صاحبہ معرفت بزم طلوع اسلام۔ راولپنڈی	۱۰۰/-	۳۹۷۷
۲۴۔ ″ مسز زیڈ مشرف صاحبہ۔ اسلام آباد	۱۰۰/-	۳۹۷۸
۲۵۔ ڈاکٹر کرم الٰہی صاحب سوسیو، کراچی ۳	۱۰۰/-	۳۹۷۹
۲۶۔ ایم ظہیر الدین صاحب۔ رحیم یار خان	۲۰۰/-	۳۹۸۰
۲۷۔ چوہدری نصر اللہ خان گھمن صاحب۔ کرم بخش (سیالکوٹ)	۱۰۰/-	۳۹۸۱
۲۸۔ محترمہ بیگم چوہدری عبدالکریم صاحب۔ ننکانہ صاحب	۱۵۰/-	۳۹۸۲
۲۹۔ اختر عباس سعید صاحب معرفت بزم طلوع اسلام کوئٹہ	۱۰۰/-	۳۹۸۳
۳۰۔ ملک حنیف وجدانی صاحب۔ مری	۵۰/-	۳۹۸۴
۳۱۔ محترمہ مسماۃ فیض النساء صاحبہ زوجہ میاں نجیب علی صاحب معرفت یوسف علی ضیاء صاحب۔ ملتان	۳۰۰۰/-	۳۹۸۵
۳۲۔ چوہدری فضل داد خان صاحب، گجرات معرفت بزم طلوع اسلام۔ گجرات	۲۰/-	۳۹۸۶
۳۳۔ سید امین قریشی صاحب۔ راولپنڈی	۵۰/-	۳۹۸۷

میزان = ۱۰۶۳۹/-

سابقہ میزان = ۷،۱۲،۲۷۱/۳۳ + ۲۵

کل میزان = ۷،۲۲،۹۱۰/۳۳ + ۲۵

کینیڈین ڈالر

اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ

(دو خدا)

ارشادِ خداوندی ہے:-

وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰـهَيْنِ اثْنَيْنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ...... (۱۶/۵۱)

اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں کہ دیکھنا! تم کہیں دو الٰہ نہ بنا لینا۔ الٰہ وہی ایک ہے۔

یہ آیت بڑی عظیم و جلیل ہے جس کا تعلق، منکرینِ خدا سے نہیں۔ خدا کے ماننے والے، ہم مسلمانوں سے ہے۔ یہ کفر و اسلام میں خطِ امتیاز اور شرک اور توحید میں حدِ تفریق ہے۔

لیکن اس کی عظمت و جلالت۔ اس کی محکمیت اور اہمیت اسی صورت میں سمجھ میں آسکتی ہے جب اِلٰـهَيْنِ کا مفہوم سمجھ میں آجائے۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ ہم شروع سے کہتے چلے آرہے ہیں کہ اسلام کی گاڑی کو دوسری (غیر اسلامی) پٹڑی پر ڈالنے کے لئے ترکیب یہ اختیار کی گئی کہ قرآن کی اصطلاحات کا مفہوم بدل دیا گیا۔ دین کی عمارت اِلٰہ کے صحیح مفہوم پر استوار ہوتی ہے۔ اس کے معنی ہیں، صاحب اقتدار۔ حاکمِ مطلق۔ واحد حکمران (اسی سے اللہ ہے۔ اور اِلٰہَین کے معنی ہیں دو اِلٰہ)۔ یہ مفہوم اس نے خود ہی واضح کر دیا۔ پہلے کہا کہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ (۱۱۲/۱) اے رسولؐ! اس حقیقتِ کبریٰ کا اعلان کردو کہ حقِ حکومت صرف اللہ کو حاصل ہے۔ اور اس کی وضاحت میں کہہ دیا کہ لَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ...... (۱۸/۲۶) وہ اپنے حقِ حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ اس میں "اَحَدًا" کا لفظ بڑا اہم ہے۔ یعنی اس میں کسی کی بھی استثنےٰ نہیں۔ خدا کے سوا کسی کو حقِ حکومت حاصل نہیں —— کسے باشد!

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ...... (۳/۷۹)

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں۔ خواہ وہ ضابطہ، قوانین کا حامل ہو۔ خواہ اس کے سپرد انتظامیہ ہو۔ حتّیٰ کہ وہ نبی بھی کیوں نہ ہو، اسے اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم اللہ سے ورے میرے محکوم بن جاؤ۔

اگر کوئی ایسا کہے گا۔ یا ایسا سمجھے گا تو وہ شرک کا مرتکب ہوگا۔

لہٰذا، صرف خدا کے احکام کی اطاعت کرنا توحید ہے۔ اور اس کے ساتھ کسی اور کے احکام کی اطاعت کرنا شرک ہے۔ رسولؐ بھی، اپنی اُمت سے خدا کے احکام کی اطاعت کراتا تھا۔ اپنے احکامات کی نہیں، کیونکہ ایسا کرنا شرک ہو جاتا۔ لَا یُشْرِكُ فِی حُكْمِهٖ اَحَدًا..... پر اس کا ایمان محکم ہوتا تھا، اور اس پر عمل کرنا اور کرانا اس کا دین۔

لیکن جب اسلام کو دوسری پٹڑی پر ڈال دیا گیا تو اِلٰہ کے معنی ہو گئے "وہ جس کی پرستش کی جائے"۔ محکومیت کی جگہ پرستش کے لفظ نے دین کا سارا نظام الٹ پلٹ کر کے رکھ دیا۔ اب "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" کے معنی ہو گئے۔ "خدا کے سوا کوئی پرستش کے قابل نہیں"۔ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ کے معنی ہو گئے پرستش صرف ایک خدا کی جائز ہے۔ مفہوم کی اس تبدیلی سے توحید کے معنی ہو گئے صرف خدا کی پرستش کرنا، اور شرک کے معنی ہو گئے بت پرستی۔ اور چونکہ مسلمان بت پرستی نہیں کرتے اس لئے ان کے توحید پرست ہونے میں شبہ ہی نہ رہا۔ اب ہمارے ہاں شرک اور توحید کی فرقہ وارانہ بحثوں کا موضوع ہوتا ہے، قبروں پر جانا۔ مُردوں سے دعائیں مانگنا۔ مزاروں پر چراغاں کرنا۔ عرس کرنا۔ نذر نیاز دینا۔ یہ شرک ہے۔ جو ایسا نہ کریں وہ موحد ہیں! یہ سوال ہی نہیں کہ محکومیت کس کی اختیار کی جا رہی ہے؟ اطاعت کس کے احکام کی جاتی ہے!

اس تمہید کے بعد آگے بڑھیئے۔ قرآن نے کہا ہے کہ

وَهُوَ الَّذِیْ فِی السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِی الْاَرْضِ اِلٰهٌ..... (۴۳/۸۴)

خارجی کائنات میں بھی اقتدار اسی کا ہے اور انسان کی ارضی زندگی میں بھی اسی کا۔

اس آیت میں اللہ تعالےٰ نے جو اپنے دائرۂ اقتدار کو دو حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ اس میں بھی ایک اہم حقیقت مضمر ہے۔ خارجی کائنات جن قوانینِ فطرت کے مطابق سرگرمِ عمل ہے، وہ کسی انسان کے وضع کردہ نہیں۔ خدا ہی کے متعیّن فرمودہ ہیں۔ لیکن (وہ کہتا ہے کہ) انسانوں کی کیفیت یہ ہے کہ یہ خارجی کائنات میں تو اس کے قوانین کا اعتراف کرتے ہیں لیکن اپنی (ارضی) زندگی کے لئے اور الٰہ تجویز اور اختیار کر لیتے ہیں۔ عصرِ حاضر کے محققین ہی کی یہ کیفیت نہیں کہ وہ قوانینِ فطرت کی حکمیت اور صداقت پر سر دھنتے ہیں۔ زمانہ نزولِ قرآن کے دانشوروں کی بھی یہی کیفیت تھی۔ اس حقیقت کو قرآنِ کریم نے متعدد مقامات میں دہرایا ہے۔ (مثلاً) سورۃ العنکبوت میں ہے:۔

اگر ان سے پوچھو کہ ارض و سماوات کو کس نے پیدا کیا ہے اور چاند اور سورج کس کے قانون کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں تو یہ اقرار کریں گے کہ اللہ ہی نے ایسا کر رکھا ہے۔ ..... یا ان سے پوچھو کہ وہ کون ہے جو بادلوں سے مینہ برساتا اور پھر اس سے زمینِ مردہ کو از سرِ نو زندگی عطا کرتا ہے۔ تو یہ اس کے جواب میں کہیں گے کہ یہ سب کچھ خدا ہی کرتا ہے۔ (۲۹/۶۱-۶۳) نیز (۲۳/۸۴-۸۸) ز (۳۹/۳۸) ز (۴۳/۹)۔

ان کے ان اعترافات کے بعد وہ ان سے کہتا ہے کہ جب تم کائنات کی وحدت کے قائل ہو۔ اور اس کے

بھی معترف ہو کہ ان میں خدا ہی کے قوانین کارفرما ہیں تو پھر اپنی ارضی زندگی کو اس سے الگ کس طرح کر سکتے ہو! جس طرح اس کے قوانین خارجی کائنات میں کارفرما ہیں اسی طرح انہیں تمہاری ارضی زندگی میں بھی نافذ العمل ہونا چاہیئے۔ لیکن ان کی حالت یہ ہے کہ

اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ ۝ (۲۱/۲۱)

یہ اپنی ارضی زندگی کے لئے اور الٰہ اختیار کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ

زندگی کو انہی کے قوانین اور پروگراموں کے مطابق پھیلنا اور آگے بڑھنا چاہیئے۔

اور اس کی تردید میں بدیہی دلیل یہ دی کہ لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ..... (۲۱/۲۲) "اگر کائنات میں ایک اللہ کے بجائے بہت سے الٰہ ہوں، جن کے اپنے اپنے قوانین نافذ العمل ہوں، تو کائنات کا سارا سلسلہ تہس نہس ہو جائے"۔

یہاں تک یہ حقیقت ہمارے سامنے آئی کہ اگر (۱) خدا کو محض پرستش کی شے تسلیم کر لیا جائے۔ یا (۲) اس کے کائناتی قوانین کی حقانیت کا اعتراف کر لیا جائے، لیکن انسانی زندگی کے لئے انسانوں کے خود ساختہ قوانین تسلیم کئے جائیں، تو یہ وہ نظام ہوگا جسے آج کی اصطلاح میں سیکولرازم کہا جاتا ہے۔ سیکولرازم میں تینوں گروہ شامل ہو جاتے ہیں۔ یعنی (۱) خدا کی ہستی ہی کے منکر۔ (۲) اس کے وجود کے تو معترف لیکن اس کا دائرۂ اقتدار صرف خارجی کائنات تک محدود ماننے والے۔ اور (۳) خدا کے قائل لیکن اسے صرف ایسی ہستی سمجھنے والے جس کی پرستش کی جائے۔

ارضی زندگی میں یہ تینوں گروہ انسانوں کے خود ساختہ قوانین کے قائل ہوتے ہیں۔ اگر یہ اس زندگی میں خدا کے قوانین کو بالکل شامل نہیں کرتے تو انہیں کافر کہا جائے گا، اور اگر خدا کے قوانین کے ساتھ انسانوں کے خود ساختہ قوانین بھی شامل کرتے ہیں تو مشرک کہلائیں گے کیونکہ یہ لَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ..... کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ ہم (مسلمانوں) کا شمار اسی زمرہ میں ہوتا ہے۔ ہم بعض احکام خدا کے مانتے ہیں اور (ان کے ساتھ) بعض انسانوں کے وضع کردہ۔ اس طرح ہم اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ کے عملی پیروکار ہیں۔ واضح رہے کہ خدا نے کہا تھا کہ لَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ..... وہ اپنے حق حکومت میں کسی کو بھی شریک نہیں کرتا۔ اس لئے احکام شریعت وضع کرنے والے کوئی بھی ہوں، خدا انہیں اپنا شریک قرار دیتا ہے۔ انہی کے متعلق وہ کہتا ہے کہ اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ ..... (۴۲/۲۱) "کیا ان لوگوں نے خدا کے شریک بنا رکھے ہیں جو ان کے لئے احکام شریعت وضع کرتے ہیں، حالانکہ خدا نے کسی کو اس کی اجازت نہیں دی"۔ یہ کون ہیں جو احکام شریعت وضع کر کے خدا کے حق حکومت میں شریک ہو جاتے ہیں؟ فرمایا: یہ علماء و مشائخ ہیں۔ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ..... (۹/۳۱)۔ ان احبار و رہبان (فقہاء و مشائخ) کی عقیدت ان کے دلوں میں اس قدر اہمیت اختیار کر لیتی ہے کہ اگر انہیں خدا کا ہمسر قرار نہ دیا جائے تو یہ سخت برہم ہو جاتے ہیں۔

وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ۚ
وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ۝ (۳۹/۴۵)

جب ان کے سامنے خدائے واحد کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دلوں میں سخت نفرت پیدا ہوتی ہے۔ لیکن جب اس کے ماسوا (ان کے احبار و رہبان کا) ذکر کیا جاتا ہے تو یہ بہت خوش ہوتے ہیں۔

آپ ان کی محفلوں اور مجلسوں، مکتبوں اور دارالعلوموں میں جا کر دیکھئے۔ خدا کا نام تو محض برائے اذنِ بیت (یا تبرکاً) لیا جائے گا۔ تمام تذکرے انہی علماء اور فقہا کے کئے جائیں گے۔ آپ ان کی احکامِ شریعت کی کتابوں کو دیکھئے۔ دس دس، بیس بیس (بلکہ ان سے بھی زیادہ) ضخیم جلدوں پر مشتمل لیکن سب انہی فقہا حضرات کے احکام و فتاویٰ پر مبنی۔ قرآن کے متعلق یہ سمجھتے ہیں کہ یہ مجمل اور نامکمل ہے۔ اس کی تکمیل انہی احکامِ شریعت سے ہوتی ہے۔ ذٰلِكُمْ بِاَنَّهٗٓ اِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ ۚ وَاِنْ يُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا ...... (۴۰/۱۲) "یہی وجہ ہے کہ جب انہیں خدائے واحد و لاشریک کی طرف دعوت دی جاتی ہے تو یہ اس سے انکار کرتے ہیں۔ ایمان اس وقت لاتے ہیں جب اس کے ساتھ ان (فقہا اور علماء) کو بھی شریک کیا جائے۔"

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ یاد رکھو..... فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ ۝ (۴۰/۱۲) "احکام صادر کرنے کا حق اور اختیار صرف خدا کو حاصل ہے جو سب پر غالب اور کبریائی کا سزاوار ہے۔ اس میں کسی اور کو شامل کر لینا کفر ہے ـــ لَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا۔"

جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے، احکامِ خداوندی میں انسانوں کے خود ساختہ احکامِ شریعت کو شامل کر لینے سے ہم عملاً اِلٰـهَيْنِ اثْنَيْنِ (دو خداؤں) کے پیروکار ہو رہے ہیں۔ اس کی بے شمار مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ لیکن ہم یہاں چند ایک پر اکتفا کرتے ہیں۔

۱۔ خدائے واحد کے احکام

(۱) زانی مرد اور عورت کی سزا سو دُرّے ہے۔

(۲) مرنے والا، اپنے پورے ترکہ کے متعلق جس کے حق میں جی چاہے وصیت کرے۔ یہ حکم خداوندی ہے۔ اور تمام مومنین پر فرض۔

۲۔ شرکاء کے احکام

(۱) غیر شادی شدہ زانی اور زانیہ کی سزا بے شک سو دُرّے ہے لیکن شادی شدہ کی سزا سنگساری ہے۔ (اس کے معنی یہ ہیں کہ حکمِ خداوندی نامکمل تھا۔ اس کی تکمیل اس غیر خداوندی حکم کو ساتھ ملانے سے کی گئی)۔

(۲) وصیت صرف ایک تہائی مال کے متعلق کی جا سکتی ہے۔ اور وہ بھی ورثا کے حق میں نہیں۔ (یہ حکمِ خداوندی کے خلاف اور علی الرغم متبادل حکم ہے)۔

(۳) غلاموں اور لونڈیوں کو خدا نے ختم کر دیا۔ (۳) بلا تعداد جس قدر جی چاہے لونڈیاں رکھی جا سکتی ہیں (یہ خدائے واحد کے خلاف بغاوت نہیں تو اور کیا ہے؟)۔

(۴) مذہب (اسلام) کے معاملہ میں کسی قسم کا جبر نہیں۔ جس کا جی چاہے اسلام لے آئے جس کا جی چاہے کفر اختیار کر لے۔ (۴) مذہب کی تبدیلی کرنے والے مسلمان (مرتد) کی سزا موت ہے۔ (یہ خدا کے حکم سے صریحاً سرکشی ہے)۔

مثالیں تو اور بھی دی جا سکتی ہیں لیکن ان کی ضرورت نہیں۔ خدا کے کسی ایک حکم کے بالمقابل دوسرا حکم آجائے تو شرک کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔

(۰)

فقہا کے قوانین سازی کے حق کا سوال ہمارے ہاں شروع سے متنازعہ فیہ چلا آتا ہے۔ اہلِ حدیث حضرات ان کے اس حق کو تسلیم نہیں کرتے۔ لیکن جہاں تک اطاعتِ رسولؐ کا تعلق ہے، اسے (بالواسطہ یا بلا واسطہ) متفق علیہ کہا جاتا ہے۔ اور یہی وہ سوال ہے جس کے صحیح طور پر نہ سمجھنے سے اُمت میں اس قدر اختلافات، تفرقات، اور انجھاڑ پیدا ہوتے چلے آرہے ہیں اور کوئی حکومت کوئی ایسا ضابطہ، قوانین مرتب نہیں کر سکتی جسے تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں۔ اگر اس بنیادی نکتہ کو قرآنی روشنی میں سمجھ لیا جائے تو یہ ساری اُلجھنیں دُور ہو جاتی ہیں۔

(۱) سب سے پہلے تو اسے سمجھ لینا چاہیئے کہ جب خدا نے کہا ہے کہ لَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا۔ تو اس میں کسی کی بھی استثنا نہیں کی گئی۔ اس کے معنی ہیں کہ قانون سازی (حکومت) کا حق، اور تو اور رسولؐ کو بھی حاصل نہیں تھا۔ اس کی وضاحت آیت (۳/۲۸) میں کر دی جہاں کہا کہ نبی کو بھی اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ لوگوں کو اپنے احکام کا محکوم بنائے۔ (یہ آیت پہلے درج کی جا چکی ہے)۔

(۲) حضورؐ کو خدا کا حکم تھا کہ آپ لوگوں سے احکامِ خداوندی کی اطاعت کرائیں۔ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ ..... (۵/۴۸) چنانچہ حضورؐ دوسروں سے بھی احکامِ خداوندی کی اطاعت کراتے تھے، اور خود بھی انہی احکام کا اتباع کرتے تھے۔ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ ..... (۶/۵۰)

(۳) مقامِ اطمینان ہے کہ خود اہلِ حدیث حضرات بھی اب اس حقیقت کو تسلیم کرنے لگ گئے ہیں کہ قانون سازی کا حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ رسولؐ کو بھی نہیں۔ طلوعِ اسلام کی اسی اشاعت میں دوسری جگہ، ماہنامہ محدث پر تفصیلی تبصرہ شائع ہوا ہے۔ اس میں سے دو ایک اقتباس یہاں مکرر درج کئے جاتے ہیں۔ اس میں کہا گیا ہے کہ

> نظامِ خلافت میں مقتدرِ اعلیٰ خود اللہ تعالیٰ ہے۔ وہی ہر چیز کا مالک اور قانون ساز ہے۔ ملتِ اسلامیہ اور انسانیت کی فلاح و بہبود کے بنیادی قوانین اللہ تعالیٰ خود بذریعہ انبیاء انسانوں کو بتلاتا ہے ایسی قانون سازی کا اختیار کسی نبی کو بھی نہیں ہوتا۔ (ص ۱۹۹)

ذرا آگے چل کر تحریر ہے :-

اسلام میں نقطۂ نظر سے کسی فرد یا ادارہ کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ خدائی قوانین میں ترمیم و تنسیخ کر سکے۔ اللہ تعالےٰ ہی قانون ساز ہے۔ کسی دوسرے کو قانون سازی کا اختیار حاصل نہیں۔ اور نہ خدا کے بنائے ہوئے قانون میں ردّ و بدل کر سکتا ہے۔ حتّٰی کہ نبی بھی ایسا نہیں کر سکتا۔ (ص ۲۰)

یہ اعتراضات ان تمام اُلجھنوں کو حل کر دیتے ہیں جو کتاب و سنّت کے باب میں لاینحل بن رہی ہیں۔ بایں ہمہ ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اطاعتِ رسُول کے سوال کو ذرا اور وضاحت سے بیان کر دیا جائے، اس باب میں دو آیات غور طلب ہیں جنہیں خاص طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ..... (۴/۶۴)

رسولوں کو اس لئے بھیجا جاتا ہے کہ حکمِ خداوندی کے مطابق ان کی اطاعت کی جائے۔

(۲) مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ..... (۴/۸۰)

جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی۔

اسلام کو اگر ایک مذہب (ہر فرد کا اپنا اپنا معاملہ) سمجھا جائے تو ان آیات سے ذہن میں اُلجھن پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ ان سے (نظر بظاہر) خدا اور رسول کی دو الگ الگ اطاعتوں کا تصوّر سامنے آتا ہے جو توحید کے خلاف ہے۔ لیکن اسلام، مذہب نہیں۔ وہ نظامِ حکومت ہے اور نظامِ حکومت کی روشنی میں ان (اور ان جیسی دیگر) آیات کا صحیح مفہوم سمجھنے میں کوئی دقّت پیش نہیں آتی۔ نہ ہی کوئی اُلجھن باقی رہتی ہیں۔

نظامِ حکومت

کسی آئینی حکومت میں ٹریفک کے چوراہے پر کھڑا سپاہی جب کسی غلط راہ رو کو ہاتھ کے اشارے سے روکتا ہے تو وہ اس سے اپنے حکم کی اطاعت نہیں کرتا۔ وہ اس حکم کی اطاعت کراتا ہے جسے نافذ کرنے کے لئے اسے وہاں تعینات کیا گیا ہے۔ اسی مثال کو اوپر تک لے جائیے۔ سپاہی سے لے کر آئی۔ جی۔ پولیس تک، سب قوانینِ مملکت کی تعمیل کرانے کے لئے مامور ہوتے ہیں۔ گورنر کی بھی یہی حیثیت ہوتی ہے۔ حتّٰی کہ صدرِ مملکت کا فریضہ بھی قانونِ مملکت کی تنفیذ ہوتا ہے۔ وہ بھی اہلِ مملکت سے قانون کی اطاعت کراتا ہے۔ اپنا حکم نہیں منواتا۔ اور وہ قانون بھی خود اس کا وضع کردہ نہیں ہوتا۔ قانون ساز اتھارٹی کا مرتب کردہ ہوتا ہے۔

انسانی دنیا میں نظامِ خداوندی یہ ہے کہ لوگ اس کے قوانین کی اطاعت کریں۔ یہ قوانین اس کتاب میں منضبط ہیں۔ لیکن کتاب کے الفاظ تو اپنی اطاعت نہیں کرا سکتے۔ ان کی اطاعت کرانے کے لئے ایک زندہ محسوس اتھارٹی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ اپنی کتاب کے ساتھ رسول بھیجتا ہے (تھا) رسول کا مقصد لوگوں سے کتابِ خداوندی کی اطاعت کرانا ہوتا تھا۔ اپنی اطاعت نہیں۔ یہ ہے مفہوم مندرجہ بالا آیت (۴/۶۴) کا جس میں کہا گیا ہے کہ خدا اپنی اطاعت رسولوں کے ذریعے کراتا ہے۔ جو شخص ٹریفک کے سپاہی کے حکم کی اطاعت کرتا ہے وہ اس سپاہی کی اطاعت نہیں کرتا۔ وہ

درحقیقت اس اتھارٹی کی اطاعت کرنا ہے جس کی اطاعت کا حکم وہ سپاہی دیتا ہے۔ اس سے اس آیۂ جلیلہ کا مفہوم (بلاتمثیل) واضح ہوجاتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی۔ (۴/۸۰) اسی نظامِ اطاعت کو حضور نبی اکرمؐ نے ان چند جامع الفاظ میں سمو کر فرمادیا کہ

من اطاعنی فقد اطاع اللہ۔ ومن اطاع امیری فقد اطاعنی۔ (بخاری۔ کتاب الاحکام)

جس نے میری اطاعت کی اس نے (درحقیقت میری نہیں بلکہ) اللہ کی اطاعت کی۔ اور جس نے میرے مقرر کردہ امیر کی اطاعت کی اس نے (اس امیر کی نہیں بلکہ درحقیقت) میری اطاعت کی۔

ایک آئینی اور نظامی حکومت میں اطاعتوں کا یہی سلسلہ نیچے سے اوپر تک مسلسل چلتا ہے لیکن یہ اطاعت ان کڑیوں (عاملِ حکومت) میں سے کسی کی نہیں ہوتی۔ یہ سب قانون کی اطاعت کرتے ہیں۔ حکومتِ خداوندی میں یہ قانون خدا کا عطا فرمودہ ہوتا ہے اس لئے یہ اطاعت آخرالامر خود خدا کی اطاعت ہوتی ہے۔ اس باب میں اور تو اور خود حضور نبی اکرمؐ بھی اپنے آپ کو خدا کا عبد (محکوم) قرار دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اگر (بفرضِ محال) مجھ سے بھی اس کے حکم کی کی خلاف ورزی ہوجائے تو مجھ سے بھی سخت مؤاخذہ ہوگا۔

خدا کی اطاعت کرانے کے لئے محسوس زندہ اتھارٹی کی ضرورت کس قدر لاینفک ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ قرآنِ خداوندی اور ارشاداتِ نبویؐ دونوں میں "سمع اور طاعت" کو لازم وملزوم قرار دیا ہے۔ یعنی "حکم کا سننا اور اس کی اطاعت کرنا"۔ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا..... (۵/۷) "جب تم نے کہا کہ ہم نے حکم سن لیا ہے اور ہم اس کی اطاعت کریں گے"۔ سورۃ النور میں ہے کہ "جماعتِ مومنین کا شیوہ یہ ہے کہ جب انہیں ان کے کسی معاملہ میں حکم دینے کے لئے بلایا جائے تو وہ کہتے ہیں — "سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا..... (۲۴/۵۱) "ہم نے سنا اور ہم اس کی اطاعت کریں گے"۔ ارشادِ نبوی ہے — لا اسلام الا بجماعۃ ولا جماعۃ الا بالامیر۔ ولا امیر الا بالسمع والطاعۃ۔ اسلام نام ہے جماعت (ہیئتِ اجتماعیہ) کا۔ اور جماعت (ہیئتِ اجتماعیہ) قائم ہوتی ہے۔ امیر (مرکزِ حکومت) سے۔ اور امیر باقی رہتا ہے اس لئے کہ اس کے احکامات کو سنا جائے اور پھر ان کی تعمیل کی جائے۔

حضورؐ کے عہدِ ہمایوں میں اللہ کی اطاعت۔ رسولؐ کی اطاعت اور امیر کی اطاعت سے یہی مفہوم تھا۔ یہ الگ الگ اطاعتیں نہیں تھیں۔ یہ اطاعتِ خداوندی کا عملی طریقہ تھا۔ جب تک امت..... کی مرکزیت کا یہ نظام قائم رہا، اس قسم کے سوال ہی پیدا نہ ہوئے کہ خدا کی اطاعت کس طرح کی جائے اور رسولؐ کی کس طرح۔ یا فقہا اور علماء کی کس طرح؟ یہ انتشار اس وقت پیدا ہوا جب امت کی مرکزیت (خلافتِ علیٰ منہاجِ رسالت) باقی نہ رہی۔ امام اور جماعت کا بابی کیا تعلق ہوتا ہے، اور جماعت بلا امام کی کیفیت کیا ہوتی ہے۔ اس کا نقشہ کسی جمعہ کی نماز کے وقت شاہی مسجد (یا کسی اور جامع مسجد) میں جاکر دیکھئے۔ لاکھ آدمیوں کا مجمع، قطار در قطار صحنِ مسجد میں کھڑا ہے۔ قدم بقدم۔ شانہ بشانہ۔ ایسے جیسے سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہو۔ سامنے ایک امام ہوتا ہے۔ اس امام کی ایک آواز پر سب جھکتے ہیں۔ سب اٹھتے ہیں۔ سب بیٹھ جاتے ہیں۔ سب دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے ہیں۔ کوئی اختلاف نہیں۔ کوئی انتشار نہیں۔ ذرا سا تفرقہ نہیں۔ یہ نتیجہ

تھا سمع وطاعت کا۔

فرضوں کی نماز کے بعد، وہی صحنِ مسجد ہوتا ہے۔ وہی نمازی۔ اُسی قسم کی نماز۔ لیکن صحن کا نقشہ کیا ہوتا ہے؟ کوئی کھڑا ہے۔ کوئی رکوع میں ہے۔ کوئی سجدہ میں ہے۔ کوئی بیٹھا ہے۔ کوئی سلام پھیر رہا ہے۔ کوئی جوتے اٹھائے صفیں چیرتا باہر نکل رہا ہے۔

وہی صحنِ مسجد جو ابھی ابھی، کامل ہم آہنگی و یک رنگی کا حیرت انگیز منظر تھا، اب یکسر خلفشار و انتشار کا عبرت انگیز مرقع ہے! اس کا سبب کیا ہے؟ صرف ایک امیر (مرکزِ امت) کی کمی۔ وہی سمع و طاعت کا فقدان ——— بلکہ یوں کہیئے کہ وہی سمع کا فقدان، کیونکہ طاعت تو (انفرادی طور پر) اب بھی ہو رہی تھی۔

صدیوں سے اُمت اسی لامرکزیت کا شکار چلی آرہی ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں :-

ہنوز ایں چرخ نیلی کج خرام است ہنوز ایں کارواں دور از مقام است

زکار بے نظام او چہ گویم تو می دانی کہ ملت بے امام است! (ارمغانِ حجاز) ص۱۱

(۱) جن لوگوں کے نزدیک مذہب ایک پیشہ ہے، ہمارا ان سے خطاب نہیں۔

(۲) جن لوگوں کے نزدیک مذہب اپنی مفاد پرستی کا ذریعہ ہے، ہمارا ان سے بھی خطاب نہیں۔

(۳) جو لوگ جہالت اور تعصب کی تاریکیوں میں اس قدر ڈوب چکے ہیں کہ وہ کسی ایسی بات کے سننے کے لئے تیار نہیں جسے صدیاں سے چلے آرہے ہیں، ہمارا ان سے بھی خطاب نہیں۔

(۴) ہمارا خطاب ہے صرف ان اربابِ قلب و نظر سے جو حقیقی اسلام کے احیاء کا جذبہ دل میں رکھتے ہیں۔ اور ہر بات کو علم و بصیرت کی روشنی میں پرکھنے کے لئے تیار ہیں۔

ان حضرات کی خدمت میں ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام کا احیا صرف ان عناصر سے وابستہ ہے۔

(۱) حاکمیت یا اطاعت صرف کتاب اللہ کی۔ اس کے ساتھ کسی اور کی حاکمیت یا اطاعت کا ملانا شرک ہے۔

(۲) خدا کی کتاب کی اطاعت کرانے کے لئے ایک زندہ اتھارٹی کی ضرورت۔

(۳) یہ اتھارٹی، اُمت کے باہمی مشورہ سے وجود میں آئے گی۔ ختمِ رسالت کے بعد مامورین من اللہ کا دور ختم ہو گیا۔

(۴) یہ مرکزی اتھارٹی قرآن کے احکام نافذ کرے گی جن کی تعمیل کرانا، عمالِ حکومت کا فریضہ ہوگا۔ ان کی تعمیل کے طرق و اسالیب زمانہ کے تقاضوں کے ساتھ (عند الضرورت) بدلتے رہیں گے لیکن قرآنی احکام و اصول ابدی طور پر غیر متبدل ہوں گے۔

یہی وہ طریق ہے جس سے اسلام کا احیاء ہوگا اور توحید کا نقش ثبت۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو (خواہ کتنی ہی نیک نیتی سے اسلام کے احیاء کی کوششیں کیوں نہ کی جائیں) اس سے ہم اسلام سے اور دُور ہوتے چلے جائیں گے، اور ہماری حالت وہی کی وہی رہے گی جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ

وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ إِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُونَ (۱۲/۱۰۶)

ان کی اکثریت ایسی ہے جو مومن کہلاتے ہوئے بھی مشرک کے مشرک رہتے ہیں۔

یاد رکھیئے! بتوں کو خدا بنا لینا اگر شرک ہے تو انسانوں کو خدا بنا لینا شرکِ عظیم! توحید لَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا ہے۔ خالص اور صرف احکامِ خداوندی کی اطاعت۔

باسمہٖ تعالیٰ

آبدی حقائق

قرآنی آئین کے بُنیادی خط وخال

اسلامی مملکت کی اساس

قرآنی آئین کے بنیادی خط و خال

کچھ دنوں سے اخبارات میں اس قسم کی خبریں گشت لگا رہی ہیں کہ حکومتِ پاکستان کے زیرِ ہدایت، اسلامی نظریاتی کونسل، مملکتِ پاکستان کے لئے "اسلامی نظام" کا مسودہ مرتب کرنے میں مصروف ہے۔ ان خبروں سے متاثر ہو کر، ہمیں قارئین کی طرف سے تقاضے موصول ہو رہے ہیں کہ ہم اس باب میں (اپنے دستور اور روش کے مطابق) قرآنی راہنمائی پیش کریں۔ یہ تقاضے معقول بھی ہیں اور برمحل بھی، اور ان کی تعمیل ہم اپنا فریضہ سمجھتے ہیں۔

ہمیں معلوم نہیں کہ اسلامی نظریاتی کونسل کے پیشِ نظر کیا پروگرام ہے اور وہ کس چیز کا مسودہ مرتب کر رہی ہے۔ اس لئے کہ "نظام" تو ایک محیط کل اصطلاح ہے جس کے اندر (اگر اسے امورِ مملکت تک بھی محدود رکھا جائے، تو بھی) حکومت کے تمام گوشے مقننہ، عدلیہ اور انتظامیہ کے تمام شعبے۔ اور کاروبارِ حکومت کے دیگر تمام امور آجاتے ہیں۔ نظام ان تمام جزئیات کا مجموعہ یا مرکب (بلکہ وحدت — UNIT) ہوتا ہے۔ لہٰذا نظامِ مملکت کوئی غیر نامی پیکر نہیں جسے شروع ہی میں بنی بنائی مکمل شکل میں تخلیق کیا جا سکتا ہے۔ جوں جوں امورِ مملکت کا عملی تجربہ حاصل ہوتا جاتا ہے، ابتدائی ہیولیٰ میں مناسب ردّ و بدل اور حک و اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اس نہج سے نظامِ مملکت کو ایک نامی تنظیم (ORGANISM) کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

اب رہا اس تنظیم (یا نظام) کا اسلامی ہونا، سو (جیسا کہ ہم گزشتہ تیس سال سے برابر پکارتے چلے آرہے ہیں) سب سے پہلے یہ طے کرنا لاینفک ہے کہ کسی چیز کے اسلامی یا غیر اسلامی قرار دینے کا معیار کیا ہے؟ لیکن ایسا آج تک نہیں ہو سکا! اس کا سبب کسی قسم کی سہل انگاری یا تغافل شعاری نہیں۔ اسے دانستہ غیر متعین رکھا جا رہا ہے۔ ہمارے ہاں مختلف فرقے ہیں اور ہر فرقہ کا "اسلامی اور غیر اسلامی ہونے کا معیار" الگ الگ ہے۔ آپ ۱۹۵۳ء کی منیر کمیٹی کی رپورٹ دیکھئے۔ ملک کے تمام علماء اس سوال کا متفق علیہ جواب نہیں دے سکے تھے کہ "مسلمان کسے کہتے ہیں؟" یہ اسی لئے کہ ان کے ہاں کسی عقیدہ یا مسلک کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کا متفق علیہ معیار کوئی نہیں۔ ان حالات میں، یہ حضرات اسی میں خیریت سمجھتے ہیں کہ اس سوال کو غیر متعین اور مبہم ہی رہنے دیا جائے تاکہ ان کا پردہ فاش نہ ہو جائے کہ ان کے یہاں اسلامی اور غیر اسلامی کا بھی کوئی متفق علیہ معیار نہیں۔ ۱۹۵۱ء میں انہوں نے یہ اعلان کیا تھا کہ یہ معیار "کتاب و سنت" ہے۔ لیکن اس معیار کو عمل میں لانے سے، ان کے باہمی اختلافات کی جو قلعی کھلی ہے وہ سب کے سامنے ہے انہی اختلافات سے مجبور ہو کر حکومت کو یہ کہنا پڑا کہ ہر فرقہ "کتاب و سنت" کی تعبیر اپنی اپنی فقہ کے مطابق کر لیا کرے۔

اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ جب "نظام" کی کیفیت وہ ہو جسے اوپر بیان کیا گیا ہے۔ اور "اسلامی" کی صورت یہ، تو مجوزہ اسلامی نظام کا جس قسم کا نقشہ مرتب ہوگا، اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

مملکت کا نظام ایک دائرے یا چار دیواری کے اندر مرتب ہوتا ہے جسے آجکل کی اصطلاح میں دستور، آئین (یا CONSTITUTION) کہتے ہیں۔ اسلام، اس آئین کے حدود (یا خط و خال) متعین کرتا ہے، اور اسلامی اور غیر اسلامی کا معیار ہے، قرآن مجید۔ اگر یہ دیکھ لیا جائے کہ قرآنی آئین کے خط و خال کیا ہیں تو اس سے اسلامی نظام کا مسئلہ اصولاً طے ہو جاتا ہے جو ملک بھی اپنے ہاں اسلامی آئین قائم کرنے کا فیصلہ کرے، اُسے قرآنی آئین نافذ کرنا ہوگا جس کے اندر اسلامی نظام بتدریج پروان چڑھے گا۔ لہٰذا، آغازِ کار قرآنی آئین سے ہوگا۔

طلوعِ اسلام اس موضوع پر لکھتا چلا آرہا ہے۔ مثلاً جب پہلی مجلسِ دستور ساز نے ۱۹۵۰ء میں قرارداد مقاصد اور دیگر اصولات کے مسودات مرتب کئے تو اس نے (نومبر ۱۹۵۰ء میں) "قرآنی دستورِ پاکستان" کے نام سے پہلا کتابچہ شائع کیا جو اس وقت تک آئین سازی کے سلسلہ میں اصولی رہنمائی کا کام دیتا ہے۔ پھر جب ۱۹۵۷ء میں، لا کمیشن کا انعقاد عمل میں آیا تو ہم نے "اسلام میں قانون سازی کا اصول" کے عنوان سے (اُردو اور انگریزی میں) دو کتابیں شائع کیں جو اس باب میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ اسکے بعد جب عسکری حکومت نے آئینی کمیشن کی تشکیل کی تو ہم نے دو مبسوط پمفلٹ شائع کئے جن میں سے ایک کا عنوان تھا "اسلامی آئین کے بنیادی اصول" اور دوسرے کا "اسلامی مملکت میں قانونِ شریعت کس طرح مرتب ہوگا"۔ علاوہ ازیں، طلوعِ اسلام کی قریب قریب ہر اشاعت میں، اس سلسلہ میں کچھ نہ کچھ شائع ہوتا رہا۔ جب ۱۹۷۱ء میں جدید آئین مرتب کرنے کی بات چھڑی تو ہم نے ایک پمفلٹ شائع کیا جس کا عنوان تھا "قرآنی آئین کے بنیادی اصول"۔ ۱۹۷۷ء میں اس کا ملخص شائع کیا گیا۔

قرآنی آئین کے سلسلہ میں دو بنیادی نکات کا پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔

دو بنیادی نکات

۱۔ قرآن کریم انسانی زندگی کے اہم مسائل کے متعلق بالعموم اصولی رہنمائی دیتا ہے۔ ان کی جزئیات خود متعین نہیں کرتا۔ یوں کہئے کہ وہ ایسی حدود مقرر کرتا ہے جن کے اندر رہتے ہوئے امتِ مسلمہ (یعنی اسلامی مملکت) اپنے اپنے زمانوں کے تقاضوں کے مطابق باہمی مشورہ سے، جزئی تفصیلات خود مرتب کرتی ہے۔ یہ اصول یا حدود غیر متبدل ہوتے ہیں اور ان کی بنیادوں پر مرتب کردہ جزئیات میں، عند الضرورت، ترمیم و تنسیخ اور حک و اضافہ ہو سکتا ہے۔

۲۔ قرآن کریم، کاروانِ ملت کے لئے ایک منتہیٰ مقرر کرتا ہے۔ اس کے سامنے ایک نصب العین رکھتا ہے، جس تک آہستہ آہستہ بتدریج پہنچا جا سکتا ہے۔ ہمارے لئے طریقِ کار یہ ہوگا کہ قرآن کے مقرر کردہ منتہیٰ کو اپنے سامنے بطور نصب العین رکھیں اور پھر یہ طے کریں کہ جس مقام پر ہم اس وقت کھڑے ہیں، اس سے، اس منتہیٰ تک پہنچنے کے لئے کونسی تدبیر کی منازل مقرر کریں۔ یوں یہ مملکت رفتہ رفتہ، آہستہ آہستہ، بتدریج اسلامی بنتی جائے گی۔ یہ نہیں کہ ادھر اس نے اسلامی نظام قائم کرنے کے عزم کا اظہار کیا، اور اُدھر ہم نے ڈھول پیٹنے شروع کر دیئے کہ مملکت اسلامی ہو گئی ہے۔ اس سے ہم اتنا ہی کہہ سکیں گے کہ مملکت نے اپنے اسلامی بننے کے عزم کا اظہار کیا ہے۔

ان تمہیدی نکات کے بعد، ان اصولوں کی طرف آیئے جنہیں قرآن کریم نے اسلامی مملکت کے آئین کے لئے بطور حدود متعین کیا ہے۔ ہمارا فریضہ ان اصولوں کو سامنے لانا ہے۔ یہ کام مجلسِ آئین ساز کا ہوگا کہ وہ موجودہ حالات کے مطابق ان اصولوں کی جزئیات مرتب کرے۔

۱۔ اقتدارِ اعلیٰ (SOVEREIGNTY)

اقتدارِ اعلیٰ سے مراد ہوتی ہے مملکت کی وہ اتھارٹی جس کا فیصلہ آخری فیصلہ ہو، اور اس سے سرکشی، مملکت کے خلاف بغاوت قرار پائے۔ ملوکیت میں یہ اتھارٹی، بادشاہ کی ذات ہوتی ہے۔ آمریت میں ڈکٹیٹر اور مغربی جمہوریت میں عوام ——— قرآن کی رو سے، یہ اتھارٹی نہ بادشاہ کو حاصل ہوتی ہے، نہ ڈکٹیٹر کو۔ نہ عوام کو حاصل ہوتی ہے، نہ خواص کو۔ یہ اقتدار صرف خدا کو حاصل ہوتا ہے جس کا ارشاد ہے کہ: اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۔ (۱۲/۴۰) حقِ حکومت، (آخری فیصلہ دینے کا حق) صرف خدا کو حاصل ہے۔ لَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ۔ (۱۸/۲۶) وہ اپنے اس حق میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ ۔ (۲۱/۲۳) اس کے کسی فیصلہ کو (QUESTION) نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے نہیں پوچھا جا سکتا کہ اس نے فلاں قانون ایسا کیوں بنایا ہے۔ اس کے سوا ہر اتھارٹی کو (QUESTION) کیا جا سکتا ہے۔ وہ (ACCOUNTABLE) ہوتی ہے۔

لیکن خدا تو نہ کسی کے سامنے آتا ہے اور نہ ہی ہم اس کی بات سن سکتے ہیں، اس لئے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کے حقِ حکومت کی عملی شکل کیا ہو گی۔ اس کا جواب اس نے خود ہی دے دیا کہ خدا کی محکومیت اس کی کتاب کی اطاعت کے ذریعے اختیار کی جائے گی۔ اس کا ارشاد ہے کہ:۔

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ۔ (۶/۱۱۵)

(اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ) کیا میں خدا کے سوا کسی اور کو اپنا حاکم بناؤں، درآنحالیکہ اس نے تمہاری طرف ایسی کتاب بھیج دی ہے جو ہر بات کو نکھار کر بیان کرتی ہے۔

لہٰذا، اسلامی حکومت اور غیر اسلامی حکومت میں فرق یہ ہے کہ اوّل الذکر میں اقتدارِ اعلیٰ خدا کی کتاب کو حاصل ہوتا ہے اور ثانی الذکر میں، انسانوں کو ——— خواہ وہ کوئی ایک فرد ہو، یا افراد کی جماعت۔ یہی کفر اور اسلام کا امتیازی نشان ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۔ (۵/۴۴)

جو کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے۔ وہی لوگ کافر ہیں۔

اسی لئے، خود حضور نبی اکرمؐ سے، جنہوں نے سب سے پہلی اسلامی مملکت قائم کی تھی، کہا گیا کہ:۔

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ۔ (۵/۴۸)

تم ان میں کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم کرو۔

آپ نے خود فرمایا کہ قرآن کریم نے اس زمانے میں، قانون کی حکمرانی (RULE OF LAW) کا تصور دیا۔ جب دنیا میں کوئی بھی اس تصور سے آشنا نہیں تھا۔ اور قانون بھی انسانوں کا وضع کردہ نہیں۔ خدا کا نازل فرمودہ جو انسانوں سے بلند و بالا ہے۔ لہٰذا خدا کے قانون کی اطاعت میں کسی شخصیت کی اطاعت کا شائبہ تک بھی نہیں ہوتا۔

اسلامی مملکت کے آئین کی شقِ اوّل یہ ہونی چاہیئے کہ:۔

۱۔ اس مملکت میں اقتدارِ اعلیٰ خدا کو حاصل ہو گا جس کی عملی شکل یہ ہو گی کہ حکومت، خدا کی کتاب (قرآن مجید) کے احکام و اصولات کے مطابق قائم کی جائے گی۔ اس کے خلاف کوئی قانون، حکم یا فیصلہ قابلِ قبول (VALID) نہیں ہو گا۔

۲۔ مجلسِ آئین و قوانین ساز کے حدود۔

قرآن کریم کے متعلق خدا کا ارشاد ہے کہ:۔

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ .... (۶/۱۱۶)

تیرے رب کی بات صدق اور عدل کے ساتھ مکمل ہو گئی۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔

بنا بریں سربراہِ مملکت ہو یا پارلیمان کا ادارہ، قرآنی احکام و اصولات میں، نہ تو حک و اضافہ کر سکتا ہے، اور نہ کسی قسم کی تبدیلی۔ پارلیمان، قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے، مملکت کے لئے قانونی جزئیات وضع کر سکتی ہے اس اعتبار سے اسلامی مملکت کی "جمہوریت" لامحدود اور غیر مشروط نہیں ہو سکتی۔ یہ (CONTROLLED DEMOCRACY) ہوگی اور اس پر کنٹرول خدا کی کتاب کا ہوگا۔

لہٰذا، اسلامی مملکت کے آئین کی دوسری شق یہ ہونی چاہیئے کہ:۔

۲۔ مملکت کے قوانین کی اساس قرآن کریم ہوگی اور مجلسِ قوانین ساز، اس کی متعین کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے، اپنے زمانے کی ضروریات کے مطابق، جزئی قوانین مدوّن کرنے کی مجاز ہوگی۔ مملکت میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں ہو سکے گا جو قرآنِ کریم کے خلاف ہو۔

۳۔ فیصلہ کن ادارہ

اس سلسلہ میں یہ سوال سامنے آئے گا کہ اس بات کا فیصلہ کس طرح کیا جائے گا کہ فلاں قانون، قرآنِ مجید کے مطابق ہے یا نہیں۔ ۱۹۶۲ء کے آئین میں اس کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا تھا۔ اس کی رو سے ایک اسلامی مشاورتی کونسل اور اس کے ذیل میں ادارۂ تحقیقاتِ اسلامیہ کا انعقاد عمل میں لایا گیا تھا۔ ہم نے اسی زمانے میں کہہ دیا تھا کہ یہ "سفید ہاتھی" محض روشنی ہنڈیاں ہیں جن سے کوئی مفید مطلب نتیجہ مرتب نہیں ہوگا۔

بعد کے تجربات نے ثابت کر دیا کہ ہماری یہ تنقید بالکل برمحل تھی۔ یہ حضرات فقہ کی کتابوں کا ترجمہ تو کر سکتے ہیں۔ اسلامی آئین و قوانین مرتب نہیں کر سکتے۔ اس کے لئے قرآنِ کریم کو اساس تسلیم کرنا اور اس کے مطابق قوانین مرتب کرنا ہوگا۔ اب حکومت نے وفاقی شرعی عدالت قائم کی ہے۔ (اس عدالت کے احترام کے باوصف ہم یہ عرض کرنے کی اجازت چاہیں گے کہ) اسلامی مملکت کیلئے آئین و قوانین سازی کا مسئلہ ان سے بھی حل نہیں ہو سکے گا۔ یہ اس لئے نہیں کہ یہ اس کی اہل نہیں یا ان میں اس کی صلاحیت نہیں۔ پوری پوری اہلیت اور صلاحیت کے باوجود یہ اس مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے گی۔ اس لئے کہ انہیں، اسلامی یا غیر اسلامی کے پرکھنے کا جو معیار دیا گیا ہے اس میں بنیادی کمزوری ہے۔ یہ معیار "کتاب و سنت" ہے اور اس کی کمزوری صفت کا اختلاف ہے (مثال کے طور پر) یہی وہ اختلاف تھا جس کی وجہ سے، رجم سے متعلق فیصلے میں ان ججوں میں باہمی اختلاف ہو گیا، اور اب حکومت ان ججوں کی اکثریت کے فیصلے کے خلاف، اپیل یا نظرثانی کی گنجائش دیکھتی ہے۔ صرف قرآن کو معیار قرار دیجئے اور پھر دیکھئے کہ ان امور میں کوئی اختلاف بھی ہوتا ہے؟ اس لئے کہ قرآن نازل کرنے والے نے، یہ کہا ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ (۴/۸۲)

اور اس کے تمام اصول صاف اور واضح (مبین) ہیں۔

لہٰذا، اصل سوال یہ نہیں کہ کون سا ادارہ اس امر کا فیصلہ کرے گا کہ فلاں قانون اسلامی ہے یا نہیں۔ اصل سوال معیار کا ہے۔ قرآنِ خالص کو معیار قرار دے کر جو نسا ادارہ جی چاہے متعین کر دیجئے۔ وہ متنازعہ امور کا فیصلہ نہایت آسانی سے کر دے گا۔ بہتر ہو گا کہ یہ فریضہ عدالتِ عالیہ کے سپرد کر دیا جائے۔

واضح رہے کہ ہم جو قرآنِ خالص کو معیار قرار دینے کا کہتے چلے آ رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ (خدانخواستہ) ہمیں سنت سے کسی قسم کا بیر ہے۔ سنتِ رسول اللہ سے (معاذ اللہ) بیر رکھنے والا تو مسلمان ہی نہیں کہلا سکتا۔ ہمارے اس اصرار کی اصلی وجہ عملی دشواری ہے۔ سنت ہر فرقہ کی الگ الگ ہے اس لئے سنت کے مطابق کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جو تمام فرقوں کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی قرار پا سکے۔ علاوہ ازیں، امت کے پاس کوئی ذریعہ ایسا نہیں جس کی رو سے حتمی اور یقینی طور پر طے کیا جا سکے کہ فلاں ارشاد رسول اللہؐ کا ہے یا نہیں۔ بنا بریں، معیار صرف قرآنِ کریم قرار پا سکتا ہے جو بلاشک و شبہ خدا کا کلام ہے اور تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ۔

ہم نے شروع میں کہا ہے کہ اسلام میں ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت دونوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ مذہبی پیشوائیت کی حکومت کو تھیاکریسی کہا جاتا ہے۔ اس مقام پر یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ تھیاکریسی کہتے کسے ہیں؟

ملوکیت (شخصی حکومت) میں حکمران کے احکام کی اطاعت لازمی ہوتی ہے۔ لیکن اس کے احکام ہنگامی یا وقتی ہوتے ہیں۔ اس کی حکومت کے ختم ہو جانے پر وہ احکام خود بخود ختم ہو جاتے ہیں۔

تھیاکریسی (یا مذہبی پیشوائیت کی حکمرانی) میں بھی احکام یا قوانین انسانوں کے وضع کردہ ہوتے ہیں، لیکن مذہبی پیشوائیت کا دعویٰ یہ ہوتا ہے کہ ان احکام میں نہ کسی کارد و بدل کیا جا سکتا ہے، اور نہ ہی یہ کبھی معدوم ہوتے ہیں۔ مذہبی پیشوا، ان احکام کو (جنہیں وہ احکام شریعت کہہ کر پکارتے ہیں) زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے کر نافذ نہیں کرتے۔ وہ ہر اس حکومت کو جو اسلامی ہونے کا دعویٰ کرے، مجبور کر دیتے ہیں کہ وہ ان احکام کو نافذ کرے۔ اسے تھیاکریسی کہا جاتا ہے۔ (یعنی بقول ان کے خدا کی حکومت اور درحقیقت ان کی اپنی حکومت)۔ جو حکومت ان احکام کو نافذ نہ کرے یہ اسے لادینی قرار دے کر اس کے خلاف، مذہب کی بنیادوں پر، ایجی ٹیشن شروع کر دیتے ہیں۔ بادنیٰ تدبر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اس حکومت (تھیاکریسی) کے سامنے دنیا کی کوئی حکومت بھی کچھ حقیقت نہیں رکھتی۔ ان حکومتوں کو یا تو ان کی بات ماننی پڑتی ہے، اور یا ان کے ساتھ مفاہمت (COMPROMISE) کرنی پڑتی۔ پرسنل لاز اور پبلک لاز کی تفریق، یا ہر فرقہ کو اجازت کہ وہ اپنی اپنی فقہ کے مطابق عمل کر لیا کرے، اسی مفاہمت کے عملی نتائج ہیں۔

اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامی حکومت جس طرح لادینی (سیکولر) حکومت کی مخالف ہے اسی طرح تھیاکریسی کی بھی مخالف۔ اسلامی حکومت، کتاب اللہ کی حدود کے اندر، امت کے مشورہ سے قائم ہوتی، اور احکام و قوانین مرتب کرتی ہے۔ تھیاکریسی میں، نہ کتاب اللہ بار پا سکتی ہے، نہ امت کے مشورہ کی کوئی گنجائش ہوتی ہے۔ ذرا اور گہرائی میں جا کر دیکھئے تو یہ بات بھی سمجھ میں آ جائے گی کہ تھیاکریسی استبداد کی شدید ترین شکل ہوتی ہے۔ سیکولر حکومتوں میں، ان کے قوانین پر تنقید کی اجازت ہوتی ہے۔ لیکن تھیاکریسی میں کسی قسم کی تنقید، ارتداد قرار دی جاتی ہے، اور مرتد کی سزا قتل ہوتی ہے۔ اور یہ سب کچھ خدا کے نام پر ہوتا ہے۔

اس سے آپ نے اندازہ لگایا ہوگا کہ علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کیوں بار بار اعلان کرتے تھے کہ "کچھ بھی ہو۔ پاکستان میں تھیاکریسی کسی صورت میں بھی قائم نہیں ہوگی"۔ تھیاکریسی اور اسلام ایک دوسرے کی ضد ہیں اندریں حالات، آئینِ پاکستان کی اگلی شق یہ ہونی چاہیئے کہ:۔

۳۔ مملکت کے قوانین، قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے امت کے مشورہ سے مرتب ہونگے۔ چونکہ قرآن کے اصول و حدود واضح اور متعین ہیں، اس لئے ان کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ اگر کسی نقطہ کی وضاحت مطلوب ہو تو اس کے لئے عدالتِ عالیہ کی طرف رجوع کیا جائے گا۔
مملکت میں تھیاکریسی کسی صورت میں رائج نہیں ہوگی۔

۴۔ نظامِ شورائیت

اسلامی مملکت کا نظامِ حکومت، شورائیت پر مبنی ہے۔ یعنی مملکت مشتمل ہوتی ہے پوری کی پوری اُمت پر، اور اس کا کاروبار، افرادِ اُمت کے باہمی مشورے سے طے پاتا ہے۔ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ۔ (۴۲/۳۸) قرآن کا واضح ارشاد ہے۔ یعنی ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے پائیں گے۔ خود نبی اکرمؐ سے بھی کہا گیا تھا کہ: وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ۔ (۳/۱۵۹) امورِ مملکت میں تم ان سے مشورہ کیا کرو۔ قرآن نے صرف یہ اصول دیا ہے۔ اس مشاورت کی عملی شکل کیا ہوگی، اس کا تعین خود نہیں کیا کیونکہ عملی شکل مختلف زمانوں میں مختلف ہو سکتی ہے۔ ہماری ضروریات کے مطابق، اس کا تعین ہمیں خود کرنا چاہیئے۔

اس اصول میں، قرآن کریم نے (بَيْنَهُمْ) کی جو شرط عائد کی ہے (یعنی افرادِ اُمت آپس میں مشورہ کریں)۔ وہ بڑی اہم ہے اور دین میں بڑی بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ یہی اسلام میں، معیارِ قومیت ہے ہم اس موضوع پر ۱۹۳۸ء سے لکھتے چلے آئے ہیں ——— اس لئے کہ مطالبۂ پاکستان کی بنیاد ہی اس دعویٰ پر تھی کہ اسلام کی رو سے، قومیت کا معیار ملک اور نسل کا اشتراک نہیں بلکہ دین کا اشتراک ہے اور طلوعِ اسلام اس دعویٰ کو، قرآن کریم اور حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کی روشنی میں، بتکرار و اصرار پیش کر رہا تھا۔ اسی معیارِ قومیت کے مطابق پاکستان کا وجود عمل میں آیا۔ اسے دو قومی نظریہ کہتے ہیں۔

ہم اس موضوع پر اتنا کچھ لکھ چکے ہیں کہ اس پر کسی اضافہ یا وضاحت کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اس (دو قومی نظریہ) کا عملی اور فطری نتیجہ یہ ہے کہ غیر مسلم قانون سازی کے امور میں حصہ نہیں لے سکتے۔ اس لئے اسلامی مملکت کی مجلسِ قوانین ساز صرف مسلمانوں پر مشتمل ہوگی۔ "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پارلیمان میں ابوجہل کا کیا کام؟" اس مملکت میں غیر مسلموں کی پوزیشن کیا ہوگی، اس کی بابت ذرا آگے چل کر گفتگو کی جائے گی۔ ۴۔ اگر مشاورتی مشینری کا طریق انتخابی ہوگا تو امیدواروں کو انتخابی مہم کی اجازت نہیں ہوگی۔ ان کا ذاتی کردار اور ماضی کی زندگی ان کے لئے معیارِ انتخاب ہوگا۔ قوم اس کا موازنہ خود کر لے گی۔ آئینِ پاکستان کی اگلی شق یہ ہوگی۔

۴۔ جملہ امورِ مملکت امت کے باہمی مشورہ سے طے ہوں گے، اس میں روزمرہ کے عام معاملات سے لیکر

سربراہِ مملکت کے تقرر تک تمام امور شامل ہیں۔ مجالسِ آئین و قوانین ساز کے ارکان بھی انہی میں شامل ہوں گے۔ مشاورت کی مشینری اُمت غور و خوض کرے گی۔ چونکہ یہ مملکت قرآنی مقاصد کو بروئے کار لانے کیلئے وجود میں آئی ہے اس لئے غیر مسلم (جو قرآن پر ایمان ہی نہیں رکھتے) امورِ مملکت کے طے کرنے میں شرکت نہیں کر سکیں گے۔ ایمان پر مبنی مملکت کا یہی انداز اور اسلوب ہو سکتا ہے۔

(غیر مسلموں کی پوزیشن کے متعلق ذرا آگے چل کر بات کی جائے گی)۔

۵۔ مذہبی فرقے اور سیاسی پارٹیاں

قرآن کریم نے جو کہا ہے کہ انسانوں کے اختلافات مٹانے کا ذریعہ "کتاب" قرار دیا گیا ہے، تو آپ نے غور فرمایا ہے کہ اس کا عملی مفہوم کیا ہے؟ کتاب کے معنی ضابطۂ قوانین کے ہیں۔ ایک ملک میں بسنے والے افراد، ایک قوم اسی صورت میں بنتے ہیں جب وہ ایک ضابطۂ قوانین کی اطاعت کریں۔ بالفاظِ دیگر، قوم کی وحدت کا انحصار، قانون کی وحدت پر ہوتا ہے۔ اگر کسی قوم کے مختلف گروہ مختلف قوانین کے تابع زندگی بسر کریں، تو ان میں کبھی وحدت نہیں پیدا ہو سکتی۔ امتِ مسلمہ بھی امتِ واحدہ اسی صورت میں بن سکتی ہے جب وہ ایک ضابطۂ قوانین کے تابع رہے۔ اور چونکہ تمام مسلمانوں کے لئے ایک ہی ضابطۂ قوانین ——— (قرآن مجید) کی اطاعت لازم قرار دی گئی ہے اس لئے ان میں تفرقہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ قرآن کریم میں نہ تو شخصی (PERSONAL LAWS) اور تمدنی قوانین (PUBLIC LAWS) کی تفریق کی گئی ہے اور نہ ہی اس میں مختلف فرقوں کے لئے مختلف فقہوں کا کوئی تصور ہے۔ امت میں فرقوں کا وجود، اس کی نصِ صریح کی رُو سے شرک ہے۔ (۳۰/۳۱) اور چونکہ اسلام میں مذہب اور سیاست کی ثنویت نہیں، اس لئے جس طرح مذہبی فرقوں کا وجود، از روئے قرآن شرک ہے، اسی طرح سیاسی پارٹیوں کا وجود بھی خلافِ اسلام ہے۔ قرآن کریم نے اسے سیاستِ فرعونی سے تعبیر کیا ہے۔ (۲۸/۴) ہمیں تسلیم ہے کہ بہ حالاتِ موجودہ مذہبی فرقہ بندی کو بیک جنبشِ قلم مٹایا نہیں جا سکتا، لیکن سیاسی پارٹیوں کو تو از روئے قانون فوراً ختم کیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک مذہبی فرقوں کا تعلق ہے، اگر

۱۔ قرآن کی اساس پر ملک کا قانون مرتب کیا جائے جس میں شخصی لاز اور پبلک لاز کی تفریق نہیں ہوتی، تو اس کا اطلاق مملکت کے تمام مسلمان باشندوں پر یکساں طور پر ہوگا۔ اس سے فرقہ بندی کی گرہیں خود بخود ڈھیلی پڑ جائیں گی۔

۲۔ تعلیم کا انتظام اس طرح سے کیا جائے کہ مذہبی اور سیکولر تعلیم کی موجودہ غیر اسلامی ثنویت ختم کر کے سب بچوں کو ایسی تعلیم دی جائے جس سے اُن میں عام دنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ قرآن کی بلند اقدار کا شعور بھی بیدار ہوتا چلا جائے۔ اس طرح ان کے دل و دماغ سے فرقہ وارانہ امتیازات کی لکیریں خود بخود مٹتی چلی جائیں گی۔

۵ ——— ۱۔ قرآن کریم کی اساس پر مملکت کے لئے جو قانون مرتب کیا جائے گا اس کا اطلاق ملک کے تمام مسلمان باشندوں پر یکساں ہوگا۔ اس میں فقہی اختلافات کا سوال پیدا نہیں ہوگا۔

۲۔ سیاسی پارٹیوں کو قانوناً ممنوع قرار دیدیا جائے گا۔ اسی طرح ہر وہ اقدام ممنوع ہوگا جس سے قوم

میں تفرقہ پیدا ہو۔

۶- بین الملّی تعلقات

دین کے اشتراک پر قومیت کی تشکیل کے صرف یہ معنی نہیں کہ کسی ایک ملک میں بسنے والے مسلمان، غیر مسلموں سے الگ ایک جداگانہ قوم کے افراد قرار پاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے (اور قرآن کا درحقیقت منشاء بھی یہی تھا) کہ دین کے رشتہ میں منسلک افراد، خواہ وہ دنیا کے کسی حصے میں بھی بستے ہوں، ایک قوم کے افراد قرار پائیں گے۔ امتِ واحدہ دُنیا میں بسنے والے تمام مسلمانوں پر مشتمل ہوتی ہے نہ کہ کسی خاص خطۂ زمین میں بسنے والے مسلمانوں پر۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو دیگر ممالک میں بسنے والے مسلمانوں کے ساتھ ہمارے تعلقات کی بنیاد نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ انتظامی نقطۂ نگاہ سے کرۂ ارض کے مختلف خطوں میں بسنے والے مسلمانوں کی الگ الگ حکومتیں تو ہو سکتی ہیں (جس طرح ایک ملک میں مختلف صوبے ہوتے ہیں) لیکن وہ الگ الگ اقوام میں نہیں بٹ سکتے۔ لیکن چونکہ اس وقت مختلف ممالک کے مسلمانوں نے اپنی اپنی الگ قومیت قائم کر رکھی ہے اس لئے ظاہر ہے کہ ہم انہیں مجبور نہیں کر سکتے کہ وہ اپنی قومیتوں کو امتِ واحدہ میں جذب کر دیں۔ ایسا رفتہ رفتہ ہی ہو سکے گا۔ دریں اثنا ہم اتنا ہی کر سکتے ہیں کہ دیگر ممالک میں بسنے والے مسلمانوں سے ہم اس قسم کے تعلقات وابستہ کریں جیسے ایک قوم کے افراد میں ہوتے ہیں۔ بنابریں، قرآنی دستورِ پاکستان کی ایک شق یہ بھی ہونی چاہیئے کہ:

> ۶- دین کے اشتراک کی بنیاد پر قومیت کی تشکیل کا فطری اور منطقی نتیجہ یہ ہے کہ مختلف ممالک میں بسنے والے مسلمانوں کو ایک قوم کے افراد تسلیم کیا جائے۔ دیگر مسلم ممالک کے ساتھ ہمارے تعلقات کی بنیاد قرآن کریم کا یہی اساسی اصول ہو گا۔

۷- صوبائی تفریق

ہم نے اوپر کہا ہے کہ قرآن کی رُو سے، ساری دنیا میں بسنے والے مسلمان، ایک قوم کے افراد ہیں، لیکن ہم نے اس وقت پاکستان میں ایسا نظام رائج کر رکھا ہے جس کی وجہ سے، خود پاکستان میں بسنے والے مسلمان بھی ایک قوم نہیں بن سکے۔ ہم نے پہلے ملک کو دو بازوؤں میں تقسیم کیا اور اب مغربی بازو کو چار ٹکڑوں میں بانٹ رکھا ہے۔ یہ تقسیم اگر محض انتظامی مقاصد کے لئے ہوتی تو چنداں مضائقہ نہ تھا۔ لیکن ہم نے ان خطوں میں الگ الگ مفادات کی ایسی دیواریں کھڑی کر دیں جن سے یہ قوم، مختلف اقوام میں تقسیم ہو گئی، اور وہ بھی ایسی اقوام جن میں باہمی رقابت، عصبیت اور نفرت کے جذبات تیز سے تیز تر ہوتے چلے جائیں۔ اگر یہی صورتِ حالات باقی رہی تو پاکستان کے مسلمان کبھی ایک قوم کے رشتہ میں منسلک نہیں ہو سکیں گے، اور مفادات باہمی کے تصادم کی خلیج بڑھتے بڑھتے نہ معلوم ہمیں کہاں تک لے جائے گی۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ایسے اقدامات کئے جائیں جن سے رفتہ رفتہ، بلوچی، سندھی، افغانی، پنجابی کے امتیازات

مٹ کر، پوری قوم، امتِ واحدہ کے قالب میں ڈھل جائے۔

۸۔ تشکیلِ حکومت

قرآنِ کریم، حکومت کی شکل (FORM OF GOVERNMENT) سے بحث نہیں کرتا۔ اسے اُمت کی صوابدید پر چھوڑتا ہے کہ وہ اپنے حالات کے مطابق جس قسم کی شکل چاہیں متعین کرلیں۔ بشرطیکہ وہ مشاورت کے اصول اور قرآن کی بالادستی سے نہ ٹکرائے۔ اس ضمن میں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ اسلامی مملکت کی پارلیمان میں، حزبِ اختلاف کا وجود نہیں ہوتا۔ غیر مسلم تو پارلیمان کے ممبر ہی نہیں ہوسکتے اور مسلمانوں کا دو ایسی پارٹیوں میں تقسیم ہوجانا جن میں سے ایک پارٹی کا مقصد دوسری پارٹی سے برسرِ پیکار رہنا ہو، اسلام کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے۔ باہمی مشاورت میں اختلافِ رائے کا سوال دوسرا ہے۔ لیکن اُمت کا مستقل طور پر دو گروہوں میں بٹ جانا، غیر اسلامی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حزبِ مخالف کے بغیر جمہوری نظام قابلِ عمل نہیں ہوتا۔ اور ہم کہتے ہیں کہ جس میں جائے وہ نظام جس کا لازمی نتیجہ، امت کا متخالف اور متحارب گروہوں میں بٹے رہنا ہو۔ یہ تو قرآنی تصور کے یکسر خلاف ہے۔ مغرب کا جمہوری نظام تو قرآن کے کئی اصولوں سے ٹکراتا ہے اس لئے اسے سند میں کیسے پیش کیا جاسکتا ہے۔

قوم میں بہرحال، عام علمی اور ذہنی سطح کے افراد بھی ہوں گے اور خاص صلاحیتوں کے مالک افراد بھی۔ مجلسِ مشاورت میں ان دونوں کی نمائندگی ضروری ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے پارلیمان دو ایوانوں پر مشتمل بھی ہوسکتی ہے۔

آئین کی اگلی شق یہ ہونی چاہیئے۔

۷۔ نظامِ حکومت امت کے باہمی مشورہ سے متعین کیا جاسکتا ہے اس شرط کے ساتھ کہ وہ قرآنی حدود اور مشاورت کے اصولوں سے نہ ٹکرائے۔

پارلیمان کے ایوانوں میں نہ مختلف پارٹیوں کا وجود ہوگا اور نہ ہی حزبِ مخالف اور حزبِ اقتدار کا۔ تمام نمائندگانِ امت، ایک وحدت کے طور پر باہمی مشاورت سے پیش آمدہ امور طے کریں گے۔

۹۔ الف۔ اصولِ اہلیت

ذمہ داریاں سونپنے کے سلسلہ میں قرآنِ کریم نے اصول یہ مقرر کیا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا..... (۴/۵۸) اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ جو اختیارات تمہیں بطور امانت دیئے گئے ہیں انہیں ان کے سپرد کرو جو ان کے اہل ہوں۔ اس "اہلیت" میں، علمی اور انتظامی صلاحیتوں کے علاوہ، سیرت و کردار کی پاکیزگی بنیادی شرط ہے کیونکہ قرآن کی رو سے، اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ۔ (۴۹/۱۳) تم میں خدا کے نزدیک سب سے زیادہ واجب التکریم وہ ہے جو سب سے زیادہ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتا ہے۔" جو لوگ قوانینِ خداوندی کی طرف سے غافل ہوں اور اپنے ہی جذبات و خیالات کے پیچھے لگ جائیں، ان کا حکم نہیں مانا جائے گا۔ سورۂ کہف میں ہے:۔

وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا۔ (۱۸/۲۸)

تم اس کی اطاعت مت کرو جس کا دل قوانینِ خداوندی کی طرف سے غافل ہوگیا، اور اس نے اپنی خواہشات کا اتباع شروع کر دیا اور اس طرح اس کا معاملہ حد سے گزر گیا۔

قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ: لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ۔ (۱۱/۴۶) "جس کا عمل غیر صالح ہو جائے وہ تمہارے اہل میں سے نہیں"۔ لہٰذا، مملکت کے افسرانِ ماتحت سے لے کر صدارتِ عظمیٰ تک، اہلیت، صالحیت اور تقویٰ (پاکیزگیٔ سیرت) کی شرائط ہر ایک پر عائد ہوں گی اور معاشرہ میں مدارجِ جوہر ذاتی اور حسنِ کردار کی رُو سے متعین کئے جائیں گے۔ لِكُلٍّ دَرَجَاتٌ مِمَّا عَمِلُوا۔ (۴۶/۱۹) ارشادِ خداوندی ہے۔ قوم کی موجودہ حالت کے پیشِ نظر ان شرائط کا بتمام و کمال پورا ہونا مشکل ہے۔ اس لئے ان کا اطلاق تا بحدِ امکان ہی ہو سکے گا۔

آئینِ مملکت کی ایک شق یہ ہونی چاہیئے کہ:۔

۸۔ صدرِ مملکت، اس کی مجلسِ شوریٰ کے ارکان (کیبنٹ) وزراء، ارکانِ مجالسِ مقننہ، (پارلیمان) اربابِ نظم و نسق، افسرانِ ماتحت اور ان دیگر افراد پر، جو کسی نہ کسی انداز سے امورِ مملکت کی سرانجام دہی سے متعلق ہوں، حسبِ ذیل شرائط کا تا بحدِ امکان اطلاق ہوگا۔

۱۔ قرآن کریم کے اصول و احکام سے واقفیت۔

۲۔ متعلقہ امور کی سرانجام دہی کی اہلیت۔

۳۔ صالحیت یعنی سیرت و کردار کی پاکیزگی۔

۴۔ ذاتی مفادات و جذبات سے بلند ہو کر، معاملات کی سرانجام دہی کی صلاحیت۔

اگر کوئی شخص کسی وقت ان شرائط میں سے کسی ایک شرط پر بھی پورا نہ اُترے تو عدالتِ عالیہ ایسا طریقِ کار وضع کرے گی جس سے اسے نہایت پُرامن طریق سے معطل یا برطرف کر دیا جائے۔

۹۔ (ب) نظامِ تعلیم

قوم کا مدار، بڑھنے پھولنے پھلنے والی نسل کی صحیح تعلیم و تربیت پر ہے اور اس کا مناسب انتظام کرنا اسلامی مملکت کا بنیادی فریضہ ہے۔ اس فریضہ کی رُو سے، بچوں کی تعلیم کی ذمہ داری ان کے والدین کے سر پر نہیں ہوگی بلکہ یہ حکومت کی اجتماعی ذمہ داری ہوگی۔ وہ مختلف مدارج پر، بچوں کو چھلنے میں چھانتی چلی جائے گی اور ہر بچے کی مزید تعلیم کا انتظام اس کی ذہنی افتاد اور طبعی رجحان کے مطابق کرتی جائے گی۔

نظامِ تعلیم میں، مذہبی اور دنیاوی تعلیم کی موجودہ غیر اسلامی تفریق ختم کر دی جائے گی جس کی رو سے الگ مذہبی درسگاہوں کی ضرورت نہیں رہے گی۔ طالب علموں کو علومِ عصرِ حاضر کی تعلیم اس انداز سے دی جائے گی کہ وہ جو مضمون بھی پڑھیں، اس میں دیکھ سکیں کہ قرآنِ مجید اس باب میں کیا راہ نمائی دیتا ہے۔ ان کی تعلیم۔

ز کلیدِ دیں درِ دنیا کشاد

کی عملی مثال پیش کرے گی۔ بنا بریں، قرآنی آئین کی ایک شق یہ ہونی چاہیئے کہ:۔

۹۔ قوم کے بچوں کی تعلیم کی ذمہ داری، انفرادی طور پر والدین کی نہیں، بلکہ اجتماعی طور پر حکومت کی ہوگی۔ نظامِ تعلیم میں، مذہبی اور دنیاوی تعلیم کی موجودہ تفریق کو ختم کر دیا جائے گا اور طالب علموں کو دنیاوی علوم کی تعلیم اس طرح دی جائے گی کہ وہ ہر شعبہ میں یہ جانچنے کے قابل ہو سکیں۔ کہ قرآنِ کریم اس باب میں کیا راہ نمائی دیتا ہے۔

۱۰۔ عدلیہ

اسلامی مملکت کا پورا نظام، عدل کے محور کے گرد گردش کرتا ہے۔ عدل میں عمرانی عدل بھی شامل ہے اور قانونی عدل بھی۔ جہاں تک عدل عمرانی کا تعلق ہے، قرآن کے اصول یہ ہیں:۔

۱۔ تمام انسانوں کو پیدائش کے اعتبار سے یکساں واجب التکریم سمجھا جائے۔

۲۔ ہر ایک کی صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے یکساں ذرائع اور مواقع بہم پہنچائے جائیں۔

۳۔ معاشرہ میں ہر ایک کی پوزیشن ذاتی صلاحیتوں کی رو سے متعین کی جائے۔

۴۔ ہر ایک کو اس کی صلاحیت کے مطابق ذمہ داری سونپی جائے۔

۵۔ بنیادی حقوقِ انسانیت کے دروازے سب کے لئے یکساں طور پر کھلے ہوں۔

لہٰذا، کوئی ایسا قانون یا طریقِ عمل جس کی رو سے، پیدائشی نسبت کے اعتبار سے انسان اور انسان میں فرق کیا جائے۔ یا جس سے کسی انسان کی تذلیل ہو، غیر قرآنی اور غیر آئینی متصور ہوگا۔ واضح رہے کہ امورِ مملکت کے سلسلہ میں، مسلم اور غیر مسلم میں جو امتیاز کیا جاتا ہے، وہ اس اعتبار سے نہیں ہوتا کہ ایک شخص غیر مسلموں کے گھر کیوں پیدا ہو گیا ہے۔ پیدائش کے اعتبار سے تو نہ کوئی مومن ہوتا ہے نہ کافر ——— یہ امتیاز اس لئے روا رکھا جاتا ہے کہ غیر مسلم اس آئیڈیالوجی کی صداقت کو تسلیم نہیں کرتا جس پر اسلامی مملکت کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ جو مملکت بھی کسی آئیڈیالوجی کی بنا پر قائم ہو۔ اس میں ان لوگوں کو شریکِ حکم نہیں کیا جا سکتا جو اس آئیڈیالوجی کو تسلیم نہ کریں۔

جہاں تک قانونی عدل کا تعلق ہے، عدل کی تعریف (DEFINITION) یہ کی جاتی ہے کہ متنازعہ فیہ امور کا فیصلہ قانون کی رو سے کیا جائے۔ یہ درست ہے، لیکن قرآن اس باب میں ایک قدم آگے جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر خود قانون ہی مبنی بر عدل نہ ہو تو اس کے مطابق فیصلہ کو عدل کیسے کہا جائے گا؟ اس کے نزدیک قانون کے مبنی بر عدل ہونے کا معیار یہ ہے کہ وہ خدا کی مقرر کردہ حدود کے مطابق ہو۔ اسی لئے اس نے عدل کی شرط یہ قرار دی ہے کہ: يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ۔ (۷/۱۸۱) الحق کے مطابق عدل کیا جائے۔ اور الحق سے مراد وحیٔ خداوندی ہے۔ یہی وجہ ہے جو ہم نے یہ تجویز کیا ہے کہ مملکت کی عدالتِ عالیہ اس امر کا فیصلہ کرے گی کہ ملک میں نافذ ہونے والا قانون قرآن کے مطابق ہے یا نہیں ——— یعنی بجائے اس کے کہ ملک میں ایک غلط (خلافِ قرآن) قانون نافذ ہو جائے اور بعد میں اسے عدالتوں میں چیلنج کیا جائے۔ یہ زیادہ مناسب ہوگا کہ عدالتِ عالیہ پہلے ہی دیکھ لے کہ مجوزہ قانون خلافِ قرآن تو نہیں۔

قانونی عدل کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ اس کا حصول بلا قیمت ہو۔ آپ سوچئے کہ کیا اس قسم کی صورت کبھی عدل

کہلا سکتی ہے کہ کسی صاحبِ قوت سے جا کر کہیں کہ میں کمزور ہوں، اور فلاں زور آور میرا حق دبا کر بیٹھ گیا ہے۔ آپ میری مدد کریں اور میرا حق اس سے دلا دیں۔ اور وہ آپ سے کہے کہ مجھے پانسو روپیہ دو تب تمہاری مدد کروں گا! اسلامی حکومت کا تو یہ فریضہ ہے کہ وہ مظلوم کی مدد کرے اور حق دار کو اس کا حق دلائے۔ ایسا کرنے میں مظلوم سے معاوضہ کس بات کا؟ یہ تو مملکت کا بنیادی فریضہ ہے اور فریضہ کی ادائیگی کے معاوضہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔

اسلامی مملکت میں عدل کا تقاضا ایک اور بھی ہے۔ حکومت اس بات کا ذمہ لیتی ہے کہ وہ افرادِ مملکت کی جان، مال، عصمت، عزت، آبرو کی حفاظت کرے گی۔ اگر کسی شخص کا (اس کی اپنی غلطی یا غفلت کے بغیر) اس باب میں کوئی نقصان ہوتا ہے تو اس کی ذمہ دار حکومت ہوتی ہے۔ حکومت کا فریضہ یہ ہے کہ

۱۔ اس شخص کے نقصان کی امکانی تلافی کرے۔ اور

۲۔ مجرم کو اس کے جرم کی سزا دے تاکہ معاشرہ میں جرائم کی روک تھام ہو جائے۔

آپ سوچئے کہ ایک شخص کا ہزار روپیہ چوری چلا جاتا ہے اور حکومت، چور کو سال بھر کے لئے قید کر دیتی ہے، تو اس سے اس شخص کے ساتھ عدل کیا ہوا جس کا مال چوری چلا گیا تھا! چور کو سزا دینا، ظالم کے ساتھ عدل ہوا، مظلوم کے ساتھ نہیں۔ عدل ظالم اور مظلوم دونوں کے ساتھ ہونا چاہیئے۔ مظلوم کے ساتھ عدل کے معنی یہ ہیں کہ اس کے نقصان کی امکان بھر تلافی کی جائے۔

قرآنی عدل کا تقاضا یہ بھی ہے کہ جب تک کسی کے خلاف جرم ثابت نہ ہو جائے، نہ اسے کسی قسم کی تکلیف پہنچائی جائے اور نہ ہی اسے معاشرہ کی نگاہوں میں حقیر سمجھا جائے۔ تفتیش کے سلسلہ میں ملزم پر پولیس کا تشدد، یا عدالتی فیصلہ تک ملزم کو جیل خانہ میں محبوس رکھنا، عدل کے منافی ہے ——— اور بغیر مقدمہ چلائے کسی کو سزا دے دینا سراسر ظلم ہے۔

قرآن کریم نے بعض جرائم (قتل، چوری، زنا اور بغاوت) کی سزا مقرر کی ہے۔ یہ سزائیں کن حالات میں اور کن شرائط کے مطابق دی جا سکتی ہیں، اس کا فیصلہ اسلامی مملکت کرے گی۔

قرآن کریم نے ہر جرم میں بعض شرائط کے تابع، معافی کی گنجائش رکھی ہے۔ قانون میں اس کی صراحت بھی ہونی چاہیئے۔

قرآن کریم نے اسلامی معاشرہ کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ اس میں لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔ (۲/۳۸) کسی کو نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن۔ خوف، خطرہ کے احساس سے لاحق ہوتا ہے اور حزن، دل کی افسردگی اور پریشانی کو کہتے ہیں۔ اسلامی مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ ایسا انتظام کرے کہ افرادِ مملکت اپنے آپ کو ہر قسم کے خطرہ سے محفوظ و مامون محسوس کریں اور امن پسند شہریوں کو کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ یہ عدل کا بنیادی تقاضا ہوگا۔

اور سب سے بڑی بات یہ کہ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ أُخْرَىٰ۔ (۶/۱۶۵) اسلامی معاشرہ میں کبھی ایسی صورت پیدا نہیں ہوگی کہ بوجھ کسی کا ہو اور اسے اٹھانا کسی اور کو پڑے۔ ہر شخص کو اپنا فریضہ آپ ادا کرنا ہوگا اور ہر فرد اپنے اعمال کے نتائج کا آپ ذمہ دار ہوگا۔ اس میں، نہ کوئی مجرم قصاص (جرم کے مؤاخذہ) سے بچ سکے گا اور نہ ہی کسی بے گناہ کو ستایا جائے گا۔ اس میں "کرے کوئی اور بھرے کوئی" کی دھاندلی بھی نہیں ہوگی اور قانون کی نگاہوں میں چھوٹے اور بڑے کی تمیز بھی نہیں ——— حتیٰ کہ سربراہِ مملکت کو بھی قانون سے بالا نہیں سمجھا جائے گا۔ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ۔ (۲/۲۷۹) اس معاشرہ کا اصول ہوگا ——— یعنی نہ تم کسی پر زیادتی کرو، نہ تم پر کوئی زیادتی کرنے پائے۔ لہٰذا، اسلامی مملکت کے آئین میں یہ شق بھی ہونی چاہیئے کہ:-

۱۰۔ معاشرتی اور قانونی عدل، مملکت کا بنیادی فریضہ ہوگا۔ معاشرتی عدل سے مراد یہ ہے کہ افرادِ معاشرہ کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جن کی تشریح "بنیادی حقوق" سے متعلق باب میں کی گئی ہے اور ان کے عدمِ حصول کی صورت میں، عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا جا سکے گا۔

"قانونی عدل" سے مراد یہ ہے کہ ہر متنازعہ فیہ معاملہ کا فیصلہ قرآنی قانون کی رُو سے ہوگا، اور اس کے لئے کوئی معاوضہ نہیں لیا جائے گا۔ نیز فیصلہ میں یہ امر ملحوظ رکھا جائے گا کہ مظلوم کے نقصان کی بھی امکانی تلافی ہو جائے۔

حکومت عدالت کے ہر فیصلہ کی پابند ہوگی اور نظامِ عدل کو معطل یا سلب کرنے، یا اس پر پابندیاں لگانے کی مجاز نہیں ہوگی۔

۱۱۔ معاشی نظام

قرآن کریم نے کہا ہے کہ مملکت کا قیام مقصود بالذات نہیں، بلکہ وہ چند ایک بلند و بالا مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ ان مقاصد میں سرِفہرست سامانِ زیست کی فراہمی ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:۔

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ۔ (۶/۱۵۲)

ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی۔

جو مملکت خدا کے نام پر قائم ہو، اس کا فریضہ ہوتا ہے کہ انسانوں کے سلسلہ میں جو ذمہ داریاں خدا نے اپنے اوپر لے رکھی ہیں۔ وہ انہیں پورا کرے۔ لہٰذا، اسلامی مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچائے۔ اور ظاہر ہے کہ کوئی مملکت ایسی عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتی جب تک وسائلِ پیداوار اس کی تحویل میں نہ ہوں۔ اگر وسائلِ پیداوار افراد کی ذاتی ملکیت میں رہیں تو مملکت اپنی اس ذمہ داری کو پورا کس طرح کر سکتی ہے؟[1]

وسائلِ پیداوار میں بنیادی حیثیت زمین (ارض) کو حاصل ہے اور زمین کو خدا نے اَرْضُ اللّٰهِ (۴/۹۷) "خدا کی زمین" قرار دیا ہے اور اسے نوعِ انسان کے روزی کا سامان بنایا ہے۔ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ۔ (۷/۱۰) اس میں جو کچھ ہے، رِزْقًا لِّلْعِبَادِ ہے۔ یعنی بندوں کے لئے رزق (۵۰/۱۱) لہٰذا، اسے سَوَاءً لِّلسَّائِلِينَ۔ (۴۱/۱۰) رہنا چاہیئے یعنی تمام ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے یکساں طور پر کھلی۔ اسے مَتَاعًا لِّلْمُقْوِينَ۔ (۵۶/۷۳) یعنی تمام بھوکوں کے لئے سامانِ رزق ہونا چاہیئے۔

زمین سے ایک تو سامانِ خوراک برآمد ہوتا ہے اور دوسرے وہ تمام خام مسالہ (RAW MATERIAL) معدنیات وغیرہ جن سے مصنوعات تیار ہوتی ہیں۔ لہٰذا، مِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْأَرْضِ (۲/۲۶۷) میں زراعت اور صنعت و حرفت، دونوں آجاتی ہیں۔

---

[1] پرویز صاحب کی اہم تصنیف، نظامِ ربوبیت، میں معاشی نظام پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

اس مقام پر اس حقیقت کا سمجھ لینا نہایت ضروری ہے کہ مملکت، ذرائع پیداوار کو اپنی تحویل میں صرف اس صورت میں لے سکتی ہے جب وہ افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو۔ اگر وہ یہ ذمہ داری پوری نہیں کرتی تو اسے وسائلِ پیداوار کو اپنی تحویل میں لینے یا رکھنے کا کوئی حق نہیں رہتا۔ اگر مملکت ایسا کرے گی تو وہ غاصب قرار پائے گی۔ اس مقصد کے لئے عدالت کی طرف رجوع کرنے کا حق ہر فردِ معاشرہ کو حاصل ہوگا۔ بنابریں، آئین میں ایک شق یہ بھی رکھی جائیگی۔

۱۱۔ تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کی ذمہ داری مملکت پر ہوگی۔ مملکت اپنی اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے وسائلِ پیداوار اپنی تحویل میں رکھے گی۔ اگر وہ اس ذمہ داری کو پورا کرنے میں قاصر رہے گی تو اسے، وسائلِ پیداوار کو اپنی تحویل میں رکھنے کا حق نہیں رہے گا۔ اس مقصد کے لئے افرادِ معاشرہ کو حق حاصل ہوگا کہ وہ عدالت کی طرف رجوع کر سکیں۔

جہاں تک اقتصادی نظام (ECONOMIC SYSTEM) کا تعلق ہے قرآن کا بنیادی اصول یہ ہے کہ معاوضہ محنت کا ہوتا ہے، سرمایہ کا نہیں۔ وہ سرمایہ کے معاوضہ کو ربوٰ قرار دیتا ہے، اور ہر ایسے نظام کو جس میں سرمایہ پر معاوضہ حاصل ہو، ربوٰ کی شق میں داخل کرتا اور اسلامی مملکت کے خلاف بغاوت قرار دیتا ہے۔ بنابریں، قرآنی آئین میں ایک شق یہ بھی ہونی چاہیئے کہ:۔

۱۲۔ مملکت کا اقتصادی نظام اس اصول پر مبنی ہوگا کہ معاوضہ صرف محنت کا ہوگا، سرمایہ کا نہیں ہوگا۔ سرمایہ کا معاوضہ، خواہ اس کی کوئی شکل بھی ہو، ربوٰ متصور ہوگی اور اسے مملکت کے خلاف بغاوت قرار دیا جائے گا۔

یہ ہے قرآن کے معاشی پروگرام کا منتہیٰ۔ اسلامی مملکت کے لئے ضروری ہوگا کہ اسے اپنے آئین میں بطور نصب العین (ULTIMATE GOAL) درج کرے۔ اور اس کے بعد ایسا عملی پروگرام مرتب کرے جس کی رو سے آہستہ آہستہ، بتدریج، اس منتہیٰ تک پہنچا جا سکے۔

۱۳۔ غیر مسلموں کی پوزیشن

آئین کی شق ۱۰ میں بتایا جا چکا ہے کہ اسلامی مملکت میں بسنے والے غیر مسلم، مسلم قوم کے افراد نہیں تسلیم کئے جا سکتے اس لئے انہیں شریکِ حکومت نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اسلام ان انسانوں پر یہ دروازے ہمیشہ کے لئے بند کر دیتا ہے۔ وہ اپنی آئیڈیالوجی کی دعوت کو عام کرتا ہے۔ یعنی وہ اس دعوت کو دنیا کے تمام انسانوں کے سامنے بلا لحاظ رنگ، نسل، وطن، زبان، مذہب یکساں طور پر پیش کرتا ہے اور ان سے کہتا ہے کہ وہ اس آئیڈیالوجی پر غور و فکر کریں، اور اس کے بعد اگر، علیٰ وجہ البصیرت اور بطیبِ خاطر (یعنی دل و دماغ کی رضامندی سے) سمجھیں کہ یہ آئیڈیالوجی ان کے لئے قابلِ قبول ہے تو اسے قبول کر لیں اور اگر ایسا نہ سمجھیں تو اسے مسترد کر دیں (شروع ہی میں یا جب جی چاہے) اس میں کسی قسم کا جبر و اکراہ نہیں ہوگا۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۔ (۲/۲۵۶)

اس سے قرآن نے، اسلامی ملت میں شامل ہونے اور اسلامی مملکت میں شریکِ کار بننے کے لئے دروازہ کھلا چھوڑ دیا

ہے کہ جس کا جی چاہے اندر داخل ہو جائے۔ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا۔ (۷۳/۱۹) "جس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف جانے کا راستہ اختیار کر لے" اس "اذنِ عام" کے بعد اگر کوئی شخص اس کے اندر آنا نہیں چاہتا تو وہ اپنے فیصلہ کا آپ ذمہ دار ہے۔ اس سے اگر وہ کسی قسم کے گھاٹے میں رہتا ہے تو اسے اس کی شکایت نہیں ہونی چاہیئے۔ اس لئے کہ ——— خود کردہ را علاجے نیست ——— یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ایک شخص کسی آئیڈیالوجی کو تسلیم نہ کرے لیکن اسے تسلیم کرنے والوں کو جو حقوق حاصل ہیں، ان میں برابر کا شریک ہو جائے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ اگر اس کے انکار سے اسے کچھ خسارہ ہوتا ہے تو اسے اس خسارہ کو برداشت کرنا ہوگا۔ اس انکار سے اس نے خیر و برکت کے جو دروازے اپنے اوپر بند کئے ہیں، اس کا وہ خود ذمہ دار ہے۔ ہمیں اس کا افسوس ضرور ہوگا، لیکن اس کا علاج ہمارے پاس نہیں۔ علاج خود ان کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ یہ دروازہ ہر وقت کھلا ہے۔ وہ جس وقت بھی اپنی غلطی کو محسوس کریں، اس کا ازالہ کر لیں۔ اس آئیڈیالوجی کو تسلیم کر لیں اور بلا روک ٹوک اس کے اندر داخل ہو جائیں۔

حیرت ہے کہ بعض حلقوں میں اس نظریہ کو قابلِ اعتراض سمجھا جاتا اور اسے "تنگ نظری" پر محمول کیا جاتا ہے حالانکہ کوئی نظام جو آئیڈیالوجی کی بنیادوں پر استوار ہو، ان لوگوں کو کبھی شریکِ حکومت نہیں کر سکتا جو اس آئیڈیالوجی کے مخالف ہوں۔

اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھیے کہ اس مملکت میں اسلامی آئیڈیالوجی کو تسلیم کرنے والوں کو جو نسبتاً چند حقوق زائد حاصل ہوتے ہیں ان کے بالمقابل ان کی ذمہ داریاں بہت زیادہ ہوتی ہیں اور غیر مسلم ان ذمہ داریوں سے مستثنیٰ ہوتے ہیں۔ اس مملکت کے مسلم باشندوں پر تو یہ ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے کہ وہ غیر مسلموں کی پرستش گاہوں کی حفاظت کریں، خواہ اس کے لئے انہیں اپنی جان تک بھی کیوں نہ دینی پڑے۔ یہ ان کے جہاد کا حصہ ہوگا اور غیر مسلم جہاد میں شرکت سے مستثنیٰ ہوں گے۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ غیر مسلموں کو اسلامی مملکت میں کوئی حقوق حاصل نہیں ہو سکتے۔ انہیں وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جنہیں قرآن کریم انسانوں کے لئے بنیادی حقوق قرار دیتا ہے۔ ان کی جان، مال، عزت، عبادت گاہیں سب محفوظ ہوں گی۔ انہیں شخصی مذہب کی آزادی ہوگی۔ ان سے حسنِ سلوک کیا جائے گا۔ (۶۰/۸) ان سے ہر حال میں عدل کیا جائے گا۔ (۵/۸)۔

ان تمام مراعات کے باوجود، اگر یہ غیر مسلم ترکِ وطن کرنا چاہیں تو انہیں ان کے امن تک بحفاظت پہنچانے کا انتظام اسلامی مملکت کے ذمہ ہوگا۔ قرآن میں ہے:۔

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ۔ (۹/۶)

اور اگر مشرکین میں سے کوئی تمہارے پاس پناہ لے تو اسے پناہ دے دو، یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے۔ پھر (اگر وہ کہیں اور جانا چاہے تو) اسے اس کے امن کی جگہ تک پہنچا دو۔ یہ اس لئے کہ یہ لوگ یہ بات سمجھتے نہیں (کہ قرآن کریم کے ماتحت زندگی بسر کرنے سے کیا کیا فوائد حاصل ہوتے ہیں)۔

لیکن اگر وہ اسلامی مملکت میں رہتے ہوئے اس سے سرکشی برتیں تو انہیں بغاوت کی سزا ملے گی۔ (۵/۳۳-۳۴)۔ یہ سزا مسلم

اور غیر مسلم سب کے لئے یکساں ہے ——— لہٰذا اسلامی آئین کی ایک شق یہ ہوگی کہ :-

۱۳۔ مملکت میں بسنے والے غیر مسلم، امورِ مملکت میں شریک نہیں کئے جا سکیں گے، کیونکہ وہ اسلامی آئین کو تسلیم نہیں کرتے لیکن ان لوگوں کو تمام بنیادی حقوقِ انسانیت حاصل ہوں گے۔ ان کی جان، مال، آبرو، پرستش گاہیں محفوظ رہیں گی۔ انہیں شخصی مذہبی آزادی ہوگی۔ عدل و انصاف کے معاملہ میں، ان میں اور مسلمانوں میں کوئی فرق نہیں کیا جائے گا۔ یہ اگر ترکِ وطن کرنا چاہیں گے تو اس کے لئے انہیں ضروری سہولتیں بہم پہنچائی جائیں گی۔

آئین کی ایک شق یہ بھی ہوگی :

۱۴۔ مملکت کے تمام باشندوں کو (بلا لحاظ مذہب، نسل، زبان، رنگ وغیرہ) وہ تمام بنیادی حقوقِ انسانیت حاصل ہونگے جو آئندہ باب میں درج ہیں۔ ان حقوق کو منسوخ یا معطل نہیں کیا جائیگا اور اگر کسی کو اس باب میں کوئی شکایت ہوگی تو اسے حق حاصل ہوگا کہ اس کے ازالہ کے لئے وہ عدالت کی طرف رجوع کرے۔ اس کے اس حق کو کسی صورت میں بھی سلب نہیں کیا جائے گا۔

(طلوعِ اسلام ان حقوق کی فہرست آئندہ اشاعت میں شائع کرے گا)۔

حرفِ آخر

یہ ہیں ہماری قرآنی بصیرت کے مطابق، اس آئین کے بنیادی اصول جنہیں قرآن کریم، اسلامی مملکت کا اساسی ضابطہ قرار دیتا ہے۔ اس آئین کے سوا کوئی آئین، میزانِ خداوندی میں قابلِ قبول قرار نہیں پا سکتا۔ ارشادِ خداوندی ہے :-

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۔ (۳/۸۵)

جو کوئی الاسلام کے سوا کوئی اور دین اختیار کرنا چاہے گا تو اس کا وہ دین (آئین) میزانِ خداوندی میں قابلِ قبول نہیں ہوگا اور وہ آخر الامر دیکھ لے گا کہ وہ کس قدر نقصان میں رہا۔

یہ آئین قرآن کریم کی دفعتین میں محفوظ ہے۔ لہٰذا اسلامی مملکت کا ضابطۂ حیات قرآن کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔ نہ ہی اس مملکت میں کوئی ایسا نظریہ، تصور یا قانون بار پا سکتا ہے جو قرآن کے خلاف ہو۔

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا۔ (۶/۱۱۵)

کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور حاکم تلاش کروں حالانکہ اس نے تمہاری طرف ایک واضح ضابطہ و قوانین نازل کر دیا ہے۔

اس آئین کے اصول و قوانین مکمل ہیں اور ان میں کوئی تغیر و تبدل نہیں کر سکتا۔

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔ (۶/۱۱۶)

اور تیرے رب کی بات صدق و عدل کے ساتھ مکمل ہو گئی۔ اس کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں، وہ سب کچھ

سننے والا اور جاننے والا ہے۔

یہی آئین خدا کی طرف سے عطا کردہ ابدی حقیقتوں پر مبنی ہے۔ اس کے سوا، انسانوں نے جو آئین و ضوابط مرتب کئے ہیں وہ ان کی جگہ نہیں لے سکتے خواہ ان کے متبعین کی کثرت کتنی ہی کیوں نہ ہو۔ ملت اسلامیہ خدا کے دیئے ہوئے الدین کے سوا، کسی آئین کا اتباع نہیں کر سکتی۔

وَإِنْ تُطِعْ أَكْثَرَ مَنْ فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ؕ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ ۔ (۶/۱۱۷)

اگر تو ان لوگوں کی بات مانتا جائے جو دنیا میں اکثریت میں ہیں تو وہ تجھے اللہ کی راہ سے گمراہ کر دیں گے۔ وہ (خود) ظن و تخمین کا اتباع کرتے ہیں اور محض اٹکلیں دوڑاتے ہیں (اس لئے ان کے پیچھے لگنے والے بھی ٹامک ٹوئیاں مارتے رہتے ہیں۔)

اس لئے آئین خداوندی کو چھوڑ کر انسانوں کے وضع کردہ آئین، قوانین کا اتباع کرنا ـــــ خواہ وہ غیر مسلم ہوں یا خود مسلمان۔ اسلامی مملکت کے لئے جائز نہیں قرار پا سکتا۔ اسلامی آئین و قوانین کی اصل و اساس خدا کی کتاب ہے۔

پھر اسے بھی ذہن میں رکھئے کہ قرآن ایک مکمل ضابطۂ آئین عطا کرتا ہے۔ اس لئے، اس کی رو سے، اس کی اجازت نہیں ہو سکتی کہ آپ کچھ اصول، قرآن کے اختیار کر لیں اور کچھ خارج از قرآن، دوسروں کے آئین و ضوابط سے مستعار لے لیں۔ ایسا کرنا شرک ہوگا۔ قرآنی آئین کو پورے کا پورا اختیار کرنا ہوگا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً ۔ (۲/۲۰۸)

اس کا واضح ارشاد ہے "کتاب کے ایک حصہ پر ایمان لانا اور دوسرے حصے سے انکار کر دینا" ایسا جرم ہے جس کی سزا اس دنیا کی ذلت و خواری اور آخرت کے عذاب شدید کی شکل میں ملتی ہے۔ (۲/۸۵) لہٰذا یہ تو کیا جا سکتا ہے کہ قرآنی آئین کو بطور نصب العین سامنے رکھ کر، اس تک بتدریج پہنچنے کی تدابیر اختیار کی جائیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ اسلامی مملکت کے آئین میں کوئی ایسی شق رکھ لی جائے جو قرآنی اصولوں سے متصادم ہو۔

اس قسم کی ایک شق بھی، سارے کے سارے آئین کو غیر اسلامی بنا دے گی۔

اور حرف آخر یہ کہ اسلامی مملکت کا نظام، اپنے تدریجی مراحل میں ہو یا انتہائی منزل میں، صرف ان لوگوں کے ہاتھوں متشکل ہو سکے گا جن کی سیرت خود قرآنی قالب میں ڈھلی ہو۔ بات محض آئین اور قانون سازی کی نہیں سیرت سازی کی بھی ہے۔

انسانوں کے وضع کردہ آئین و قوانین، مشین کی مانند ہوتے ہیں کہ جو بھی اس کے کل پرزوں کا ماہر ہو وہ اسے چلا سکتا ہے، بلا لحاظ اس امر کے کہ اس کا کیریکٹر کیسا ہے۔ لیکن قرآنی آئین و قوانین کی یہ صورت نہیں۔ ان کے لئے ذہنی استعداد کے علاوہ قلبی تبدیلی (تطہیر قلب و نگاہ ـ یعنی پاکیزگی سیرت و کردار) بھی لازمی شرط ہے۔ اسی لئے تو اقبالؒ نے کہا تھا کہ

نیست ممکن ایں کتاب فقیہان ا ــــ ے پسر

فقہ میکانکی قوانین کا نام ہوتا ہے اور اس کے جاننے والے، اس مشین کے کل پرزوں کے ماہر۔ یہ قوانین وہ نفسیاتی تغیر

پیدا نہیں کر سکتے جو اسلامی زندگی کی اساس و بنیاد ہے۔ یہ تو قوم کی قرآنی تعلیم و تربیت ہی سے ممکن ہے۔

خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں، تو کچھ بھی نہیں

اس پر اعتراض کیا جائیگا کہ یہ پروگرام تو بڑی لمبی مدت چاہتا ہے۔ ٹھیک ہے۔ یہ بڑی لمبی مدت چاہتا ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ تپ دق یا کینسر کا علاج ایک انجکشن سے ممکن نہیں۔ اس کے لئے لمبا عرصہ درکار ہوگا۔ گنڈے تعویذوں کے (SHORT CUTS) سے، فریب تو کھایا، اور دیا جا سکتا ہے۔ مرض کا علاج نہیں کیا جا سکتا۔ نہ ہی جرائم کی سزاؤں سے یہ علاج ممکن ہے۔

علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے، ساقی!!

تحریکِ پاکستان کی عمارت

ان تین ستونوں پر استوار تھی :-

۱- اسلام ایک آزاد مملکت ہی ... میں زندہ حقیقت بن سکتا ہے۔
۲- مسلمان، دین کے اشتراک کی بنیاد پر غیر مسلموں سے ایک الگ قوم ہیں۔ اور
۳- ان دعاوی کو پیش کرنے والے (قائدِ اعظمؒ) کا حسنِ کردار۔

پرویز صاحب، قائدِ اعظمؒ کے زیرِ ہدایت، حق و باطل کی اس جنگ میں بذاتِ خود شریک تھے۔ اور انہوں نے ان موضوعات پر جو کچھ لکھا وہ ہمارا انمول تاریخی سرمایہ ہے۔

حال ہی میں انہوں نے، ان تفصیلات کو تین نہایت جامع مقالات میں سمویا، جنہیں ملک میں بڑی اہمیت حاصل ہوئی۔ یعنی

۱- حسنِ کردار کا نقشِ تابندہ۔
۲- کیا قائدِ اعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے۔ اور
۳- دو قومی نظریہ ____ قائدِ اعظمؒ اور علامہ اقبالؒ، کی نظروں میں۔

قارئین کے تقاضوں پر، ادارہ طلوعِ اسلام نے ان سہ مقالات کو، نہایت حسین اور دلکش کتابچہ کی شکل میں شائع کیا ہے ____ مطالعہ کے لئے پر از معلومات۔ لائبریری کے لئے سامانِ زینت اور دوستوں کو پیش کرنے کے لئے دلآویز تحفہ۔ قیمت دس روپے (علاوہ محصول ڈاک)

(محدود تعداد میں موجود ہے) ____ : ملنے کا پتہ : ____

(۱) ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲، لاہور (۲) مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار۔ لاہور

جس کتاب کا برسوں سے انتظار تھا۔ وہ
بالآخر شائع ہو گئی۔ (فالحمد للہ)

پرویز صاحب متعارف تو مفکرِ قرآن کی حیثیت سے ہیں، لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ وہ کون کونسی ہوش رُبا وادیوں اور حیرت فروش منزلوں سے گذر کر اس چشمۂ نور و حیات تک پہنچے ہیں۔ ان کا بچپن، تصوف کے خواب آور گہوارہ میں گذرا۔ جب ان کے شعور نے آنکھ کھولی تو ان کے دل میں خلش پیدا ہوئی کہ معلوم کیا جائے کہ تصوّف کی اصل و بنیاد کیا ہے۔ جسے مشاہدۂ حقیقت کہا جاتا ہے اس کی کنہ و ماہیت کیا ہے۔ واردات قلبی کا سرچشمہ کونسا ہے۔ مختلف ریاضتوں اور مراقبوں سے جو روحانیت حاصل ہوتی ہے اس کی نوعیت کیا ہے۔ تعویذوں اور گنڈوں میں اثر کیسے پیدا ہوتا ہے۔ کرامات کس طرح سرزد ہوتی ہیں۔ یہ، اور اسی قسم کے سینکڑوں سوالات ان کے سینے میں اُبھرے جن کے حل کی تلاش میں وہ برسوں صوفیائے کرام کی درگاہوں اور خانقاہوں۔ ہندو سادھوؤں کی سمادھیوں اور سنیاسیوں کے یوگ آشرموں میں سرگرداں رہے اور اس طرح جو کچھ پڑھا تھا اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ جو کچھ سنا تھا اس کا ذاتی مشاہدہ کر لیا۔ ان واردات و مکاشفات کا علم و تجربہ حاصل کرنے کے بعد وہ دانشِ نورانی (کتاب اللہ) کے سنگِ آستاں پر سجدہ ریز ہو گئے۔

اب انہوں نے اپنی ان آستاں نوردیوں اور خانقاہ پیمائیوں کی سرگذشت اور خود تصوّف کی تاریخ کو اپنے مخصوص دلآویز انداز میں، اپنی تازہ ترین تصنیف۔

تصوّف کی حقیقت

میں منضبط کر دیا ہے۔ اس کے دو حصّے ہیں ــــ حصّہ اوّل، تصوّف اور اسلام ــــ حصّہ دوم، تصوّف اور اقبالؒ ــــ مستور حقیقتوں کا آئینہ، اور سربستہ رموز و اسرار کا گنجینہ ــــ کتابت، طباعت، کاغذ عمدہ ــــ جلد مزیّن اور مطلا ــــ ضخامت چار سو صفحات سے زائد۔ قیمت -/۷۵ روپے (محصول ڈاک -/۵ ")

کتاب کی ترسیل ۵ اکتوبر ۱۹۸۱ء کے بعد شروع کی جا سکے گی۔

ــــــ ملنے کا پتہ: ــــــ

(۱) ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور ۱۱ (۲) مکتبۂ دین و دانش۔ چوک اُردو بازار لاہور

سلیم کے نام

پرویز صاحب نے شروع ہی سے، اپنی قرآنی فکر و پیغام کا اوّلین مخاطب، قوم کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کو قرار دیا ہے کیونکہ (بقول ان کے) اسی طبقہ کے بگڑنے سے قوم بگڑتی ہے اور اسی کے سنورنے سے سنورتی۔ اس طبقہ کے قلب و دماغ میں صحیح انقلاب پیدا کرنے کے لئے انہوں نے ایک سنجیدہ، شگفتہ، دلآویز سا سلسلہ شروع کیا جسے "سلیم کے نام خطوط" سے تعبیر کیا گیا۔ ان خطوط نے فی الواقعہ قوم کے نوجوان طبقہ کی ذہنیت بدل دی۔

اس سلسلہ کے، تین حصے شائع ہوئے تھے لیکن حصہ اوّل، کچھ عرصہ سے نایاب تھا۔ اب اسے دوبارہ شائع کیا گیا ہے جس سے تینوں جلدوں کا سیٹ مکمل ہوگیا ہے۔ پہلے اس سلسلہ کو خطِ نسخ (ٹائپ) میں چھاپا گیا تھا لیکن قارئین کے تقاضوں کے پیشِ نظر، اب اس جلد اوّل کو خوبصورت خطِ نستعلیق میں شائع کیا گیا ہے۔ باقی جلدوں کی اشاعتِ ثانیہ پر بھی یہی اسلوب اختیار کیا جائے گا۔

- جلد اوّل، عمدہ سفید کاغذ پر چھاپی گئی ہے۔
- بکس بورڈ کی جلد پر ٹائیٹل بڑا جاذبِ نگاہ ہے۔

تقطیع کلاں ۳۰×۲۰/۸ ضخامت ۲۶۴ صفحات ـــــ قیمت ۲۵/- روپے فی جلد۔ (محصولڈاک ۴/- ")

○ اب ان تینوں جلدوں کی قیمت حسبِ ذیل ہوگی۔

- جلد اوّل ـــــــــ ۲۵/- روپے
- جلد دوم ـــــــــ ۱۵/- روپے
- جلد سوم ـــــــــ ۱۵/- روپے

(علاوہ محصولڈاک)

ملنے کا پتہ:

(۱) ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲۔ لاہور ۱۱　(۲) مکتبۂ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن

جسے مقامی بزم ہائے طلوع اسلام کے اہتمام سے ہفتہ وار یا ماہانہ، کیسٹ یا ٹیپ ریکارڈرز کے ذریعے حسب ذیل مقامات اور اوقات پر باقاعدگی کے ساتھ نشر کیا جاتا ہے۔

نوٹ :- پرویز صاحب کے درس کے دوران ہی متعدد کیسٹیں اور ٹیپیں بزموں کے لئے ریکارڈ کرلئے جاتے ہیں۔

نام بزم طلوع اسلام	دن اور وقت	مقام درس کے کوائف :-
لاہور	جمعہ ۹ بجے صبح	۲۵/بی گلبرگ ۲ (نزد پولیس سٹیشن) فون نمبر ۸۸۰۸۰۰
لنڈن (انگلینڈ)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۲ بجے دوپہر	149 SUTTON COURT RD. LONDON (E-13. 9NR) PHONE-01-552-1517
برمنگھم (انگلینڈ)	ہر ماہ کا پہلا اتوار دو بجے دوپہر	(بمقام) 60, HERICK RD SALTLEY, B8 INT.
اوسلو (ناروے)	ہر ماہ کا پہلا ہفتہ شام ۶ بجے	(بمقام) MR MANZOOR AHMAD, DOVRE GATE-7/OSLO-I
ٹورنٹو (کینیڈا)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۱۰ بجے صبح	335 DRIFTWOOD AVE. #311, DOWNS VIEW. TORONTO (NORTH YORK) (ONT): M3N-2P3. PHONE (416) 661-2827
کراچی ۲	ہر جمعہ ۹ بجے صبح	کتب خانہ بزم طلوع اسلام کمرہ ۲۲ ہارون چیمبرز ۔ الطاف حسین روڈ نیو چالی ۔ فون ۲۳۸۸۲۸
پشاور	(۱) ہر جمعہ ۵ بجے شام (۲) ہر جمعہ ۹ بجے صبح	رہائش گاہ آغا محمد یونس صاحب ۔ رفیق لین صدر (OPP : VIP. MAINGATE) پشاور سٹیڈیم بالمقابل نعمت کدہ ۔ یونیورسٹی روڈ ۔ جہانگیر آباد۔ فون ۴۲۷۴۹
مردان	ہر جمعہ ۱۰ بجے صبح	عبداللطیف ۔ محمود علی صاحب ۔ اکاخیل بلڈنگ نواب علی روڈ
راولپنڈی	ہر جمعہ ۵ بجے شام	جی ۔ ۱۹۶ لیاقت روڈ
لیہ	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	شبیر میکینیکل انجینئرنگ ورکس ۔ شہید روڈ (لیہ)
ایبٹ آباد	ہر جمعہ ۴ بجے شام	رہائش گاہ صلاح الدین صاحب واقع 234-K-L کیہال (ایبٹ آباد)
سرگودھا	ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر	چوک واٹر سپلائی مکان نمبر ۳ ۔ نظامی منزل
بہاولپور	ہر جمعہ ۸ بجے صبح	عثمانی خیراتی شفاخانہ ۔ غنی پورہ باہتمام (ڈاکٹر ہومیو) محمد اعظم خان صاحب
چکوال	ہر جمعہ ۱۰ بجے صبح	ضیا ٹیوشن سنٹر، نزد ہجویری مسجد باہتمام ماسٹر غلام حسین صاحب نمائندہ بزم طلوع اسلام۔
کوئٹہ	باقاعدہ ہفتہ وار	رابطہ کے لئے ریڈیو اینڈ الیکٹرک سنٹر، ۔۔ روڈ ۔ باہتمام غلام صابر صاحب۔
گوجرانوالہ	ہر جمعہ ۵ بجے شام	دفتر بزم ملحق رہائشگاہ :- چوہدری مقبول شوکت ۔ گل روڈ سول لائنز
گجرات	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ و ہر اتوار ۴ بجے سہ پہر	بمقام ۔ ۱/۱۲ بی کچہری روڈ ۔۔۔ باہتمام شیخ قدرت اللہ صاحب ایڈووکیٹ
جلالپور جٹاں	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	دفتر بزم طلوع اسلام (بازار کلاں)
ملتان	ہر جمعہ ۹ بجے صبح	دفتر شاہ سنز بیرون پاک گیٹ (فون ۳۱۰۷۱)
پنجکسی (تحصیل کبیر والا ضلع ملتان)	ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر	بمقام ۔ مطب حکیم احمد الدین صاحب (نمائندہ بزم)
ہنگو	ہر جمعہ ۵ بجے شام	رہائش گاہ محمد جمیل صاحب واقع ریلوے روڈ (فون نمبر ۹۶)
فیصل آباد	ہر جمعہ ۳ بجے بعد دوپہر	بمقام ۔ حیات سرجری کلینک ۲۳/ پیپلز کالونی ۱ (فون ۴۲۸۵۵)

طلوعِ اسلام کا مقصد و مسلک

(جسے معلوماتِ عامہ کے لئے وقتاً فوقتاً شائع کیا جاتا ہے۔)

(۱) تنہا عقلِ انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت نہیں کر سکتی۔ اسے اپنے رہنمائی کے لئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی ضرورت۔

(۲) خدا کی طرف سے عطا شدہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لئے ابد تک ضابطۂ ہدایت ہے۔ لہٰذا اب نہ خدا کی طرف سے کسی کو وحی مل سکتی ہے نہ کوئی نبی یا رسول آ سکتا ہے۔ قرآنِ کریم خدا کی آخری کتاب اور حضور رسالتمآب خدا کے آخری نبی اور رسول ہیں۔

(۳) قرآنِ کریم کا ہر دعویٰ علم پر مبنی ہے اور اس کے حقائق زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہیں۔ قرآنی حقائق کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ جس حد تک انسانی علم ترقی کر چکا ہے وہ انسان کے سامنے ہو اور چونکہ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے کہ خدا نے تمام کائنات انسان کے لئے تابعِ تسخیر کر رکھی ہے اس لئے خدائی پروگرام کو پورا کرنے کے لئے کائناتی قوتوں کی تسخیر ضروری ہے۔

(۴) نبی اکرم کی سیرتِ مقدسہ، شرف و عظمتِ انسانیت کی معراجِ کبریٰ ہے۔ یہی وہ پاکیزہ سیرت ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لئے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ) ہے۔ حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کا جو حصہ قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہے اس کے قطعی یا یقینی ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ باقی رہا وہ حصہ جو قرآن سے باہر ہے۔ سو اس میں اگر کوئی بات ایسی ہے جو قرآن کے خلاف جاتی ہے یا جس سے حضورؐ پر (معاذ اللہ) کسی قسم کا طعن پایا جاتا ہے تو ہمارے نزدیک وہ بات غلط ہے۔ اسے حضورؐ کی طرف منسوب نہیں کرنا چاہیئے۔ یہی اصول صحابہ کبارؓ کی سیرتِ مقدسہ کے سلسلہ میں بھی سامنے رکھا جانا چاہیئے۔

(۵) دین کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسانوں کو دوسرے انسانوں کی محکومی سے چھڑا کر ان سے خالص قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرائے۔ قوانین کی یہ اطاعت ایک نظامِ مملکت کی رو سے ہو سکتی ہے اس کے بغیر دین (جو نظامِ زندگی کا نام ہے) ممکن نہیں ہو سکتا۔

(۶) رسول اللہؐ نے سب سے پہلے دین کا نظام قائم فرمایا۔ اس نظام میں قرآنِ کریم کے احکام و قوانین کی اطاعت کرائی جاتی تھی اور جن امور میں قرآنِ کریم نے صرف اصول دیئے ہیں ان کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے امورِ مملکت باہمی مشورہ سے سرانجام پاتے تھے۔

(۷) رسول اللہؐ کے بعد دین کا وہی نظام حضورؐ کے خلفائے راشدینؓ نے جاری رکھا۔ اس میں امورِ مملکت سرانجام پانے کا وہی طریقہ تھا جو رسول اللہؐ کے زمانہ میں رائج تھا۔ یعنی قرآنِ کریم کے احکام و قوانین کی اطاعت اور جن امور میں قرآنِ کریم نے

صرف اصول دیئے ہیں ان کی چار دیواری کے اندر اُمت کے مشورہ سے متعلقہ امور کے فیصلے۔ اس طریق کو خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کہا جاتا ہے۔

(۸) بدقسمتی سے خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کا یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے بعد منقطع ہو گیا اور دین کا نظام باقی نہ رہا۔ اس سے اُمت میں انتشار پیدا ہو گیا۔ خلافت کے زمانے میں تمام امور، دین کے نظام کے تابع رہتے تھے۔ لیکن اب مذہب اور سیاست میں ثنویت پیدا ہو گئی۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری ہے۔

(۹) ہمارے لئے کام کرنے کا یہ ہے کہ پھر سے خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کا سلسلہ قائم کیا جائے جو اُمت کو احکام و قوانینِ خداوندی کے مطابق چلائے۔ ظاہر ہے کہ اس نظام کو چلانے والوں کی اپنی زندگی سب سے پہلے قوانینِ خداوندی کے تابع ہو گی۔

(۱۰) چونکہ دین کا نظام (خلافت علیٰ منہاجِ رسالت) زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہو گا۔ اس لئے اس میں موجودہ ثنویت ختم ہو جائے گی۔ یعنی اس میں یہ نہیں ہو گا کہ سیاسی معاملات کے لئے حکومت کی طرف رجوع کیا جائے اور مذہبی یا شخصی امور کیلئے مذہبی پیشوائیت کی طرف۔ اس میں یہ دونوں شعبے باہم گڑ مدغم ہو جائیں گے۔

(۱۱) جب تک اس قسم کا نظام قائم نہیں ہو جاتا، اُمت کے مختلف فرقے جس جس طریق پر نماز، روزہ وغیرہ اسلامی احکام پر عمل کر رہے ہیں، کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ ان میں کوئی ردّ و بدل کرے یا کوئی نیا طریقہ وضع کر کے اُسے "خدا اور رسول" کا طریقہ قرار دے۔

(۱۲) قرآنی نظام کا مقصود یہ ہے کہ خدا کی متعین کردہ مستقل اقدار کے مطابق انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ نظام تمام افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی، روٹی، کپڑا، مکان، علاج، تعلیم وغیرہ بہم پہنچانے کا ذمہ دار ہو۔

(۱۳) قرآن کا نظام اپنی نوعیت کا واحد اور منفرد نظام ہے اس لئے نہ وہ دنیا کے کسی اور نظام میں جذب ہو سکتا ہے نہ ان سے مفاہمت کر سکتا۔ خواہ وہ مغرب کا جمہوری سرمایہ دارانہ نظام ہو یا سوشلزم کا آمرانہ اشتراکی نظام۔ اس کے نزدیک یہ سب نظام ہائے زندگی غیر خداوندی ہیں لہٰذا باطل۔

(۱۴) جہاں تک احادیث کا تعلق ہے ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآنِ کریم کے مطابق ہو، یا جس سے حضور نبی اکرمؐ یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔

(۱۵) ہم، رسول اللہؐ کے بعد، ہر قسم کے مدعیٔ وحی کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔

(۱۶) طلوعِ اسلام کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے نہ مذہبی فرقہ سے (اسے فرقہ اہلِ قرآن سے بھی کوئی تعلق نہیں)۔ نہ ہی یہ کوئی نیا فرقہ پیدا کرنا چاہتا ہے اس لئے کہ اس کے نزدیک دین میں فرقہ سازی شرک ہے۔ اُمت کے مختلف فرقے جس طریق سے نماز، روزہ وغیرہ کی ادائیگی کرتے ہیں، ہم ان میں کسی قسم کا ردّ و بدل نہیں کرتے۔ اور بلا ردّ و بدل ان کی پابندی کرتے ہیں۔ ہم قرآنِ کریم کی تعلیم کو عام کرتے ہیں تاکہ کسی طرح پھر سے قرآنی نظام (خلافت علیٰ منہاجِ رسالت) کا قیام عمل میں آ سکے۔ یہ ہے ہمارا مسلک، جسے ہم برسوں سے دہراتے چلے آ رہے ہیں۔ اس کے خلاف جو کچھ ہماری طرف منسوب کیا جاتا ہے، وہ مخالفین کا گمراہ کن پروپیگنڈہ ہے۔

(۰)

جمہوریت یا اسلام؟

فرقہ اہلِ حدیث کے ترجمان، ماہنامہ محدث (لاہور) نے (جنوری۔فروری ۱۹۸۱ء کا) ایک خاص نمبر شائع کیا ہے جس کا عنوان ہے "جمہوریت یا اسلام"۔ اس میں سے چند ایک چیدہ چیدہ نکات پیشِ خدمت قارئین کئے جاتے ہیں جو گہرے غور و تدبر کے متقاضی ہیں۔

(۱) قانون سازی کا اختیار

نظامِ خلافت میں مقتدرِ اعلیٰ خود اللہ تعالیٰ ہے۔ وہی ہر چیز کا مالک اور وہی قانون ساز ہے۔ ملتِ اسلامیہ اور انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے بنیادی قوانین اللہ تعالیٰ خود بذریعہ انبیاء انسانوں کو بتلاتا ہے۔ ایسی قانون سازی کا اختیار کسی نبی کو بھی نہیں ہوتا۔ (صفحہ ۱۹۹)

(ب) اسلامی نقطۂ نظر سے کسی فرد کو یا ادارہ کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ خدائی قوانین میں ترمیم و تنسیخ کر سکے ...... اللہ تعالیٰ ہی قانون ساز ہے۔ کسی دوسرے کو قانون سازی کا اختیار حاصل نہیں۔ اور نہ خدا کے بنائے ہوئے قانون میں ردّ و بدل کر سکتا ہے۔ حتیٰ کہ نبی بھی ایسا نہیں کر سکتا۔ (صفحہ ۲۰۰)

(ج) اس معاشرہ کا حکمران کوئی مطلق العنان یا مقتدرِ اعلیٰ شخصیت نہیں ہوتی بلکہ قانونی لحاظ سے وہ عام آدمی کی سطح پر ہی ہوتا ہے۔ اس کی حکمرانی صرف ان معنوں میں ہے کہ وہ خدائی قوانین کی منشا کہ اطاعت کے لئے طریق کار وضع کرے۔ (صفحہ ۲۰۲)

آپ ان الفاظ پر بار بار غور کیجئے کہ

قانون سازی کا اختیار صرف خدا کو حاصل ہے۔ کسی انسان کو نہیں۔ حتیٰ کہ نبی کو بھی نہیں۔ کوئی انسان خدا کے قوانین میں ردّ و بدل نہیں کر سکتا حتیٰ کہ نبی بھی ایسا نہیں کر سکتا۔

اگر ہم شروع میں یہ نہ بتاتے کہ یہ اقتباسات کہاں سے لئے گئے ہیں تو یقیناً آپ یہی سمجھتے کہ یہ طلوعِ اسلام کے کسی مقالہ کے اقتباسات ہیں۔ لیکن تماشا یہ ہے کہ اگر طلوعِ اسلام یہی کچھ کہے تو منکرِ حدیث، منکرِ سنت اور منکرِ رسالت (فلہذا ملحد و بے دین) قرار پائے، اور انہی معتقدات کا اظہار، محدث کرے تو حامئ حدیث و سنت ٹھہرے!

بہرحال، ہم مؤقر جریدہ محدّث کو اس اظہارِ حق پر مستحقِ مبارکباد قرار دیتے ہیں۔ اس سے واضح ہو گیا کہ (ان حضرات کے نزدیک بھی) اسلام میں ضابطۂ قوانین، قرآنِ مجید ہے اور اس میں کسی قسم کے تغیّر و تبدّل کا حق (فقہا تو ایک طرف) حضور نبی اکرمؐ کو بھی حاصل نہیں تھا۔ اس سے "کتاب و سنّت" کا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ (خود ان حضرات کے عقیدہ یا اعتراف کے مطابق) سنّت کی رُو سے نہ تو قرآنی قوانین میں کسی قسم کا اضافہ ہو سکتا ہے، کیونکہ قانون سازی کا حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ اور نہ ہی ردّ و بدل۔ فالحمدللہ علیٰ ذالک۔

(۰)

۲۔ عبادت کا ترجمہ

طلوعِ اسلام نے، لفظ عبادت کا ترجمہ، اطاعت یا محکومیت کیا تو شور مچا دیا گیا کہ یہ خدا کی پرستش کا منکر ہے۔ زیرِ نظر محدّث اس باب میں لکھتا ہے:۔

> ملوکیت میں ایک انسان کی غلامی ہوتی ہے۔ جمہوریت میں پارلیمنٹ کی۔ اس طرح دوسرے نظامہائے حکمرانی میں جو فرد یا ادارہ مقتدرِ اعلیٰ ہوگا، وہ حاکم اور عوام یا رعایا اس کی غلام ہوگی ۔۔۔۔۔۔
> خلافت میں امیر اور رعایا پر ایک ہی قانون نافذ ہوتا ہے۔ دونوں اللہ کے بندے اور غلام ہوتے ہیں۔ کوئی انسان کسی حاکم یا ادارے یا دوسرے انسان کا غلام نہیں ہوتا۔ حضورؐ نبی اکرم نے اہلِ نجران کے نام جو نامہ مبارک لکھا تھا، اس میں درج ذیل الفاظ قابلِ غور ہیں۔
> ۔۔۔۔۔ امابعد فانی ادعوکم الی عبادۃ اللہ من عبادۃ العباد ۔۔۔۔۔۔
> اَزاں بعد تمہیں بندوں کی غلامی سے نجات دلا کر اللہ کی غلامی اور عبدیت کی طرف بلاتا ہوں۔ (صـ۲۱۰)

آپ نے دیکھا کہ عبادت کا مفہوم غلامی یا محکومی بنایا گیا ہے، نہ کہ پرستش۔ اگر یہ حضرات عبادت کے اس مفہوم پر ٹکے رہیں تو کتنے الجھاؤ دُور ہو جائیں۔ غیر قرآنی نظام میں "خدا کی عبادت" کا تصوّر اور امکان ہی نہیں رہتا ہے! اسی بنا پر ہم تحریکِ پاکستان کے دوران، ان حضرات سے کہتے تھے کہ متحدہ ہندوستان میں، مسلمانوں کے لئے "خدا کی عبادت" کا امکان ہی نہیں، وہاں "خدا کی پرستش" ہو سکے گی۔ عبادت (محکومیت) نہیں ـــــ عبادت کے مفہوم کے اس فرق سے دین، مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ مذہب میں خدا کی پرستش ہوتی ہے۔ دین میں اس کی محکومیت۔ سیکولرازم میں خدا کی پرستش کی آزادی مل سکتی ہے۔ خدا کی محکومیت کی نہیں۔

(۰)

۳۔ مشاورت

ہم شروع سے اس حقیقت کو پیش کرتے چلے آ رہے ہیں کہ قرآن کریم کے بنیادی اصولوں (اساسی قوانین و حدود)

کی جزئیات (یعنی وہ طور طریق جن کے مطابق ان قوانین پر عمل کیا جائے گا) اسلامی مملکت، اُمّت کے مشورہ سے متعین کرے گی۔ محدّث میں اس موضوع پر تفصیلی بحث کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ خود حضورؐ نبی اکرم نے بھی یہی طریق اختیار کیا تھا کہ ایسا کرنے کے لئے آپ کو خود خدا نے حکم دیا تھا۔ چنانچہ محدّث میں، اس قسم کی کئی ایک مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ مثلاً:-

(۱) جنگِ بدر کے قیدیوں کا معاملہ۔

(۲) اذان کا تعیّن۔

(۳) مشاورت متعلقہ غزوہ احد۔ (صفحہ ۱۲۶ - ۱۲۱)

اسی طرح، خلافتِ راشدہ کے نظائر کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

محدّث کے اس اعتراف سے ایک ایسے بنیادی مسئلہ کا حل مل جاتا ہے جو شروع سے اُمّت میں مابہ النزاع چلا آرہا ہے اور جسے دین کی اساس قرار دیا جاتا ہے۔ اہلِ حدیث حضرات سورۃ النجم کی آیات وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ..... (۵۳/۳-۴) کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ رسول اللہؐ کا ہر قول (اور عمل) وحی کی بنا پر ہوتا تھا۔ اسی سے ان کا عقیدہ ہے کہ ایک وحی قرآنِ کریم میں درج ہے اور دوسری وحی احادیث میں، ان دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر حضورؐ کا ہر قول وحی پر مبنی ہوتا تھا تو آپؐ صحابہؓ سے مشورہ کیوں کیا کرتے تھے؛ ظاہر ہے کہ جو معاملہ مشورہ کے بعد طے ہوتا تھا، وہ وحی خداوندی نہیں ہوتا تھا۔ حضورؐ کی مشاورت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وحیٔ خداوندی صرف قرآن کے اندر تھی اور اس وحی پر عمل درآمد، باہمی مشاورت سے ہوتا تھا جس میں بعض اوقات فیصلہ خود حضورؐ کی رائے کے بھی خلاف طے پاتا تھا۔

اور یہ بھی واضح ہے کہ جو معاملات مشورہ سے طے پائیں، وہ ابدی اور غیر متبدّل نہیں ہو سکتے۔ اس سے احادیث کی پوزیشن واضح ہو جاتی ہے۔ اسی بنا پر امام ابوحنیفہؒ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ

> رسول اللہؐ کا طریقہ یہ تھا کہ آپ تعیینِ جزئیات (تدوینِ فقہ) میں صحابہؓ سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ اور جس کی رائے بہتر معلوم ہوتی، اسے اختیار فرما لیا کرتے تھے۔ اگر میں بھی رسول اللہؐ کے زمانے میں ہوتا تو اس مجلسِ مشاورت میں شریک ہوتا۔ اور میرا خیال ہے کہ کئی امور میں حضورؐ میری رائے کو اختیار فرما لیتے۔ (آپ فرماتے کہ) دین اس کے سوا کیا ہے کہ وہ اچھی اور عمدہ رائے کا نام ہے۔ (تاریخ خطیب بغدادی۔ جلد ۱۳۔ صفحات ۳۹۰ ر ۳۸۷)

اور اسی سے فقہی قوانین کی پوزیشن بھی واضح ہو جاتی ہے۔ یعنی ابدی اور غیر متغیر صرف قرآن کے احکام و قوانین ہیں۔ حدیث ہو یا فقہ کسی کی یہ حیثیت نہیں۔ قرآنی احکام و اصول اور اُمّت کی مشاورت۔ یہ ہے اسلامی نظام!

مشاورت کی اہمیّت

اُمّت کی مشاورت کی اہمیّت کے متعلق، محدّث نے دو ایک نہایت اہم اقوال درج کئے ہیں۔ (مثلاً)

(د) حضرت عمرؓ کا ارشاد ہے کہ لاخلافۃ الا عن مشورۃ۔ مشاورت کے بغیر خلافت نہیں۔
(ص ۸۳)

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کا بیان ہے:۔
امارت وہ ہے جسے قائم کرنے میں مشورہ کیا گیا ہو اور بادشاہی وہ ہے جس پر تلوار کے زور سے قبضہ حاصل کیا گیا ہو۔ (ص ۸۳)

محدث نے، بخاری کے حوالے سے، حضرت ابوبکرؓ صدیق کی بیعتِ خلافت کی روئداد بڑی تفصیل سے لکھی ہے۔ اس میں حضرت عمرؓ کا یہ قول نمایاں طور پر درج کیا گیا ہے کہ

جس کسی نے مسلمانوں کے مشورہ کے بغیر کسی کی بیعت کی تو بیعت کرنے والا اور جس کی بیعت کی گئی، دونوں کو قتل کر دیا جائے گا اور (پھر فرمایا) دیکھو! میں پھر ... یہی کہتا ہوں کہ جو شخص مسلمانوں کے مشورہ کے بغیر کسی کی بیعت کر لے تو دوسرے لوگ، اس کی پیروی نہ کریں، نہ اُس کی جس کی بیعت کی گئی۔ کیونکہ دونوں اپنی جانیں گنوا بیٹھیں گے۔ (ص ۴۲ تا ۴۴)

یہ ہے اسلامی مملکت اور اسلامی نظام کی اصل اور بنیاد۔ یہ اس لئے کہ قرآن کریم کی رُو سے، مملکت کسی خاص فرد کو نہیں، پوری کی پوری اُمت کو دی جاتی ہے۔ لہٰذا، اقتدار اسی کو مل سکتا ہے جسے اُمت باہمی مشاورت سے اس کی اہل سمجھے۔

———— (۰) ————

وحدتِ اُمّت

اسلام ایک اجتماعی نظامِ زندگی قائم کرتا ہے۔ یہ نظام جس قوم کے ہاتھوں قائم ہوتا ہے، وہ اسے اُمّت تعبیر کرتا ہے۔ چونکہ اس اُمّت کے تمام افراد کے لئے ایک ہی نظام ہوتا ہے اس لئے اُمّت کی وحدت بھی اس کی لازمی شرط ہے۔ فلہٰذا، وحدتِ نظام اور وحدتِ اُمّت لازم و ملزوم ہیں۔ اگر اُمّت میں افتراق و انتشار پیدا ہو جائے تو وہ نظام بھی باقی نہیں رہتا۔ یا یوں کہئے کہ جب وہ نظام باقی نہ رہے تو اُمّت کی وحدت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ پھر اس میں فرقے پیدا ہو جاتے ہیں۔ ارشاداتِ نبویؐ میں اسے تمسّک بالجماعت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے: وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ...... (۳/۱۰۲) اے جماعتِ مومنین۔ تم سب مل کر۔ اجتماعی طور پر، خدا کی کتاب کے ساتھ تمسّک رہنا اور فرقوں میں نہ بٹ جانا۔ جماعت، اسی جمیعًا کی عملی شکل کا نام ہے۔ محدث نے "ملّی وحدت" کے عنوان سے، تمسّک بالجماعت کی اہمیت پر تفصیلی طور پر گفتگو کی ہے۔ اس نے لکھا ہے۔

ملّی وحدت تین عناصر سے عبارت ہے۔ جماعت۔ امیر اور فرد۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:
لا اسلام الا بالجماعۃ، ولا جماعۃ الا بالامیر، ولا امیر الا بالسمع والاطاعۃ۔
جماعت کے بغیر اسلام کی سربلندی ناممکن ہے اور امیر کے بغیر جماعت منظم نہیں رہ سکتی اور امیر

کی امارت اس وقت تک بار آور نہیں ہو سکتی جب تک ہر شخص اس کا حکم سن کر اس کی بات نہ مانے۔
اب اس ملی وحدت کو برقرار رکھنے کے لئے ارشاداتِ نبوی ملاحظہ فرمایئے۔
ملتِ اسلامیہ کا خلیفہ ایک ہی شخص ہو سکتا ہے۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

اذا بویع لخلیفتین فاقتلوا الاخر منھما۔ (مسلم، کتاب الامارۃ والقضاء)

جب دو خلیفوں کی بیعت ہونے لگے تو بعد والے کو قتل کر دو۔

اور فقہائے اُمّت کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ اگر ایک ہی وقت (بغیر تقدیم و تاخیر) دو خلیفوں کا انتخاب واقع ہو تو دونوں کا انتخاب کالعدم قرار پائے گا اور نئے سرے سے خلیفہ کا انتخاب ہوگا۔

امیر کی اطاعت اور جماعت سے وابستگی

ارشادِ باری ہے:۔

اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ۔ (۴/۵۹)

اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ پھر حاکموں کی جو تم میں سے ہوں۔

"اولی الامر" سے خلیفہ کے علاوہ وہ دوسرے تمام حکام بھی مراد ہیں جو شوریٰ انتظامیہ یا عدلیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

طلوع اسلام اس آیت (اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ) کا مفہوم یہ پیش کرتا چلا آرہا ہے کہ "اطاعتِ خدا و رسول" سے مراد اسلامی مملکت کی مرکزی اتھارٹی کی اطاعت ہے جو نظامِ خداوندی کے قائم کرنے کی ذمہ دار ہے، اور اولی الامر منکم کی اطاعت سے مراد، اس مرکزی حکومت کے مقرر کردہ، ماتحت عمال کی اطاعت۔ ہماری مذہبی پیشوائیت کی طرف سے، اس مفہوم کی مخالفت ہوتی تھی۔ ان کے نزدیک اولی الامر سے مراد علماء حضرات ہیں جو "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" کے فریضہ کی ادائیگی کے ذمہ دار ہیں۔ غنیمت ہے کہ محدث نے اس کا یہ مفہوم نہیں لیا اور کہا ہے کہ اس سے مراد، شوریٰ۔ انتظامیہ۔ عدلیہ سے تعلق رکھنے والے حکام ہیں۔ لیکن اس میں ..... پھر ایک الجھاؤ پیدا کر دیا گیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ

اولی الامر سے خلیفہ کے علاوہ، وہ دوسرے تمام حکام بھی مراد ہیں جو شوریٰ، انتظامیہ یا عدلیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

رسول اللہؐ کی زندگی میں تو خلیفہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے محدث کا پیش کردہ یہ مفہوم کہ اولی الامر سے خلیفہ اور اس کے علاوہ دیگر حکام مراد ہیں، اس نظام پر صادق نہیں آسکتا جس کے سربراہ حضورؐ تھے۔ اب رہا حضورؐ کے بعد کا اسلامی نظام، سو اگر اس میں خلیفہ بھی اولی الامر میں شامل تھا، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ

(۱) خلیفہ کس کا مقرر کردہ ماتحت حاکم تھا؟

(۲) اور اگر خلیفہ ماتحت حکام میں شامل تھا تو "اطاعتِ خدا اور رسولؐ" کی عملی شکل کیا تھی؟ کس کی اطاعت "خدا اور رسولؐ کی اطاعت" متصوّر ہوتی تھی؟

(۳) اگر خلیفہ کا شمار بھی ماتحت حکام میں ہوتا تھا تو نظامِ مملکت قائم کس طرح رہ سکتا تھا؟ نظام تو ایک مرکزی اتھارٹی (CENTRAL GOVT.) کا متقاضی ہوتا ہے۔

(۴) خلفائے راشدینؓ مرکزی اتھارٹی کی حیثیت رکھتے تھے یا ماتحت حکام کی؟

اصل یہ ہے کہ ہمارے یہ قدامت پرست حضرات آجکل عجیب کشمکش میں گرفتار ہیں۔ اسلام کے متعلق قدیم تصوّرات ان کے قلب کی گہرائیوں میں پیوست ہیں۔ لیکن وہ تصوّرات عملاً اسلامی نظام میں فٹ نہیں بیٹھتے۔ یہ حضرات ان تصوّرات سے انکار بھی نہیں کر سکتے اور یہ کہنے کی بھی جرأت نہیں رکھتے کہ ان تصوّرات کی رُو سے اسلامی نظام کا قیام ناممکنات میں سے ہے۔ وہ ..... قدامت پرستی اور ماڈرنزم کے بین بین رہنا چاہتے ہیں لیکن ایسا ممکن نہیں۔ اس لئے ان کی یہ سعیٔ لاحاصل عجیب مضحکہ انگیز صورت اختیار کر لیتی ہے۔ محدّث نے خلیفہ کو اولی الامر (ماتحت حکام) میں شامل کرتے وقت سوچا ہی نہیں کہ اس کا عملی نتیجہ کیا نکلے گا؟

قرآنِ کریم کی رُو سے، "اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسولؐ" سے مراد، اسلامی نظامِ مملکت کی مرکزی اتھارٹی کی اطاعت ہے۔ حضورؐ کی زندگی میں، یہ مرکزی اتھارٹی آپؐ خود تھے۔ حضورؐ کے بعد، حضورؐ کے خلفاء اور اولی الامر سے مراد مرکزی حکومت کے ماتحت حکام ہیں۔ حضورؐ کی زندگی میں بھی، اور حضورؐ کے بعد بھی، یہ نظام قرآن کی بنیادوں پر ہر زمانے میں قائم ہو سکتا ہے۔ اس نظام میں مرکزی اتھارٹی کی اطاعت، بمنزلہ اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کے ہوگی۔ اور اولی الامر کی اطاعت ماتحت حکام کی اطاعت۔

(۰)

ملّی وحدت کے متعلق محدّث کی مزید تصریحات ملاحظہ فرمائیے۔ تحریر ہے۔ "ملّی وحدت کے متعلق اب ارشاداتِ نبویؐ ملاحظہ فرمائیے:۔

(۱) عن ابی ھریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال من اطاعنی فقد اطاع اللہ ومن عصانی عصی اللہ ومن اطاع امیری فقد اطاعنی ومن عصی امیری فقد عصانی۔ (بخاری۔ کتاب الاحکام)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ اور جس نے میرے مقرر کئے ہوئے حاکم کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے میرے امیر کی نافرمانی کی اس نے گویا میری نافرمانی کی۔

(۲) عن عبد اللہ بن عمر یقول کنا نبایع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی السمع والطاعۃ یقول لنا فیما استطعتم۔

(مسلم۔ کتاب الامارۃ، باب البیعۃ علی السمع والطاعۃ۔ بخاری)

عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں۔ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حکم سننے اور فرمانبرداری کرنے کی شرط پر بیعت کرتے تھے۔ آپ ہمیں کہتے: اپنی استطاعت کے مطابق (یا مقدور بھر تمہیں سمع و طاعت لازم ہے)۔

(۳) عن عرفجة قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول من اتاکم وامرکم جمیع علی رجل واحد یرید ان یشق عصاکم او یفرق جماعتکم فاقتلوہ (مسلم۔ کتاب الامارہ والقضاء)

عرفجہ رضؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے اگر تمہارے معاملات کسی ایک شخص پر اکٹھے ہوں پھر کوئی شخص تمہاری قوت کو توڑنے یا تمہاری جماعت میں تفرقہ ڈالنے کی کوشش کرے تو اسے قتل کر دو۔

(۴) عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من خرج من الطاعۃ وفارق الجماعۃ ثم مات، مات میتۃ جاھلیۃ (مسلم، کتاب الامارۃ)

ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو کوئی امیر کی اطاعت سے نکلا، اور جماعت سے الگ ہوا، پھر مر گیا تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔

امیر اگر نسل کے لحاظ سے کہتر یا شکل کے لحاظ سے بدصورت ہو تو بھی اس کی اطاعت بدستور واجب ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

(۵) ان أمّر علیکم عبد مجدّع یقودکم بکتاب اللہ فاسمعوا لہ واطیعوا (مسلم۔ ایضاً)

اگر تم پر نکٹا غلام بھی امیر بنا دیا جائے تو جب تک وہ تمہیں اللہ کے احکام کے مطابق چلاتا ہے۔ اس کی بات سنو اور اس کی اطاعت کرو۔

ایسے امیر کے احکام کی ہر حال میں ــــ تنگی یا آسانی۔ وہ احکام رعایا کو پسند ہو یا ناپسند ــــ اطاعت واجب ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

(۶) السمع والطاعۃ علی المرء المسلم فیما احب وکرہ مالم یؤمر بمعصیۃ فاذا امر بمعصیۃ فلا سمع ولا طاعۃ۔ (متفق علیہ) (بخاری کتاب الاحکام)

"ہر مسلمان پر سننا اور اطاعت کرنا لازم ہے خواہ وہ حکم اسے پسند ہو یا ناپسند جب تک کہ وہ گناہ کا حکم نہیں دیتا۔ اور اگر وہ گناہ کا حکم دے تو پھر نہ اس کی بات سنو نہ اطاعت کرو۔"

ضمناً۔ ان احادیث میں "السمع والطاعۃ" پر زور دیا گیا ہے۔ قرآن کریم میں بھی "سمعنا واطعنا" (۲/۲۸۵) (دیگر متعدد مقامات) آیا ہے۔ یعنی احکام کو سننا اور ان کی اطاعت کرنا۔ اس سے واضح ہے کہ اسلامی نظام کے لئے ایک زندہ اتھارٹی کی موجودگی لابدی ہے جس کا حکم سنا جائے۔ محض کتابوں میں درج شدہ احکام کی اطاعت سے یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ محدث نے بھی اسے تسلیم کیا ہے جب کہا ہے کہ

ملتِ اسلامیہ کے لئے امام کے بغیر ایک لمحہ بھی گذارنا ناقابلِ برداشت ہے۔ (ص۲۱)

لیکن "امام" ہر فرمانروا کو نہیں کہا جا سکتا۔ اسلامی نظام اور اس کے امام کی خصوصیات اور امتیازات قرآن کریم میں واضح ہیں۔ اُمت خلافتِ راشدہ کے بعد آج تک بلا امام چلی آ رہی ہے لیکن جو اسلاً اس دوران میں رائج تھا' ہماری مذہبی پیشوائیت اسے صحیح اسلام قرار دے رہی ہے اور اسی کے عملی نفاذ کی اب کوششیں ہو رہی ہیں۔

(۰)

مذہبی فرقے اور سیاسی پارٹیاں

وحدتِ اُمت کی اہمیت سامنے آنے کے بعد، مذہبی فرقوں اور سیاسی پارٹیوں کا سوال لازماً سامنے آنا چاہیئے تھا۔ جہاں تک مذہبی فرقوں کا تعلق ہے، محدّث نے لکھا ہے:۔

> تیسری لعنت وہ مذہبی فرقے ہیں جو اپنی الگ الگ فقہ کو سینے سے چمٹائے ہوئے ہیں اور اس بات پر مصر ہیں کہ کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (۳۰/۳۲) "سب فرقے اسی میں خوش ہیں جو ان کے پاس ہے" کے مصداق جو کچھ ان کے پاس ہے بس وہی ٹھیک ہے۔ باقی سب غلط ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ قرآن تو سب کا ایک ہے۔ اور سنّت بھی ایک ہے لیکن فقہیں چار ہیں بلکہ اگر شیعہ حضرات کی فقہ جعفریہ بھی شامل کر لیں تو پانچ ہیں جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی فقہ دین کا حصّہ نہیں ہے۔ (ص۲۲)

آپ غور فرمایئے کہ فرقہ پرستی کس قسم کی ذہنیت پیدا کر دیتی ہے! محدّث کا کہنا یہ ہے کہ

(۱) اہلِ فقہ کے فرقے تو لعنت ہیں، لیکن اہلِ حدیث کا فرقہ لعنت نہیں (کیونکہ یہ خود اس سے متعلق ہیں)۔ اور "کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ" کا اطلاق ان پر ہوتا ہے، ان پر نہیں ہوتا! ہر فرقہ یہی کہہ کر فرقہ پرستی کو مستحکم کئے رہتا ہے۔ اور یہ قرآن کی رُو سے شرک ہے۔ (۳۰/۳۱)

(۲) محدّث کا کہنا ہے کہ قرآن سب کا ایک ہے اور سنّت بھی ایک ہے۔ ہم اپنے اس معاصر سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ وہ کونسی کتاب ہے جس میں مندرج "سنت" کو تمام فرقے متفقہ طور پر سنت تسلیم کرتے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ ہر فرقہ اپنے مسلک اور اپنے شرعی احکام کو سنت پر مبنی قرار دیتا ہے۔ سنّت کا یہی اختلاف تو تھا جس کے پیشِ نظر مودودی (مرحوم) نے کہا تھا کہ کتاب و سنّت کی بنا پر پاکستان میں کوئی ایسا ضابطہ، قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جسے تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں۔ یہ کہنا کہ "سنّت سب کی ایک ہے" بہت بڑی مغالطہ آفرینی ہے۔ زبان سے سب یہی کہتے ہیں اور عملاً ہر ایک اس کی تغلیط کرتا ہے۔ اگر "کتاب و سنّت" ہر ایک کی ایک ہی ہے تو آپ شرعی اداروں میں اپنے فرقہ کی الگ نمائندگی کا مطالبہ کیوں کرتے ہیں؟

(۳) ان فرقوں کا اختلاف تو نماز، روزہ وغیرہ احکام کی ادائیگی میں سامنے آجاتا ہے۔ ہم سے جب پوچھا جاتا ہے کہ ان اختلافات کی شکل میں کیا کیا جائے، تو ہمارا جواب یہ ہوتا ہے کہ اس وقت مختلف فرقے جس طرح ان کی ادائیگی کر رہے ہیں، ان پر کوئی اعتراض نہ کیا جائے۔ نہ کوئی نیا طریق وضع کیا جائے۔ نہ مروّجہ طریقوں میں کسی قسم

کا ردّوبدل کیا جائے۔ جب کبھی اسلامی مملکت وجود میں آئے گی تو جس شکل کو وہ مقرر کریگی اس کا اتباع ساری قوم کے لئے لازمی ہوگا۔ یوں یہ اختلافات رفع ہو سکیں گے۔ محدّث نے بھی یہی حل بتایا ہے۔ لکھا ہے:۔

اس کا دوسرا حل یہ بھی ہے کہ ایسے فروعی مسائل جن میں ہر فریق کے پاس اولۂ شرعیہ موجود ہوں۔ (جیسے حنفی۔ شافعی وغیرہ کے مختلف فیہ مسائل) ان میں سے کسی ایک جانب کو اگر امیر، یا خلیفہ متعیّن کر کے لوگوں کو اس پر عمل کرنے کا حکم دے تو ان کا فرض ہوگا کہ اس کا اتباع کریں۔ اگرچہ بہ حیثیت حنفیت یا شافعیت اس کے مذہب کے خلاف ہو۔ (صفحہ ۲۲۷)

امید ہے اہلِ حدیث بھی اسے تسلیم کر لیں گے!

(۴) تشکیلِ پاکستان کے فوری بعد ہم نے لکھا تھا کہ ہندوستان سے جو مسلمان ادھر آ رہے ہیں وہ کوئی نہ کوئی ایسا ہنر جانتے ہیں جس سے وہ (وسائل میسّر آجانے کے بعد) اپنی روٹی کما لینے کے قابل ہو جائیں گے لیکن ایک طبقہ ایسا ہے جو کوئی ہنر نہیں جانتا اور دوسروں کی کمائی پر زندگی بسر کرتا ہے۔ یہ ہے ہمارے مذہبی پیشواؤں کا طبقہ جو ہجوم کر کے اِدھر آ رہا ہے۔ ان کا بسیرا پرستش گاہوں میں ممکن تھا لیکن مشکل یہ ہے کہ۔ غیر مسلموں کی متروکہ پرستش گاہیں۔ (مندر۔ گرجے۔ گوردوارے) انہیں الاٹ نہیں کئے جا سکتے۔ اور مساجد میں پہلے سے امام اور مؤذن موجود ہیں۔ لہٰذا ان کی روزی کا مسئلہ مشکل پیدا کر دے گا۔ ہم نے حکومت سے کہا تھا کہ وہ ان کی کفالت کا ذمہ لے لے اور آئندہ اس قسم کے بے ہنر افراد پیدا نہ ہونے دے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو یہ بے ہنر، بے کار افراد حصولِ رزق کیلئے معلوم کیا کیا حربے اختیار کریں؟ اس سے ملک کو عجیب قسم کی نازک مشکلات کا سامنا کرنا پڑ جائے گا۔

ہماری اس بات پر کسی نے کان نہ دھرا، اور اس کا جو نتیجہ نکلا وہ ہم سب کے سامنے ہے۔ پاکستان کا مشکل ترین مسئلہ یہی بن گیا ہے!

محدّث نے ہماری ہم نوائی میں لکھا ہے کہ

اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ فروعی اختلاف کو ہوا دینے والا علمائے سوء کا وہ گروہ ہے جس کا روزگار ان مسائل سے وابستہ ہے۔ اگر علماء اور ائمہ مساجد کی کفالت کی ذمہ داری حکومت لے لے، جس طرح سعودی عرب میں ہے، تو یہ تفرقہ و انتشار کی فضا بہت کم کی جا سکتی ہے۔ (صفحہ ۳۲-۲۳۱)

ان حضرات کی یہ خاص ٹیکنیک ہے کہ جب ان حضرات سے علماء کی خرابیوں کا اعتراف کئے بغیر بن نہیں پڑتی، تو کہہ دیتے کہ یہ "علماء سوء" کی خرابیاں ہیں، لیکن کبھی یہ نہیں بتاتے کہ یہ "علماء سوء" کون کون سے ہیں۔ ان میں سے ہر شخص اپنے ان کے علماء کو علماء حق قرار دیتا ہے اور دوسروں کے علماء کو علماء سوء۔

محدّث کا ارشاد ہے کہ یہ مسلک ان علماء سوء کا ہے جن کا روزگار ان مسائل سے وابستہ ہے۔ کیا ہم اپنے معاصر سے یہ پوچھ سکتے ہیں کہ علماء حق کے روزگار کا ذریعہ کیا ہے؟ یہ جو ہوائی جہازوں میں ساری دُنیا کا چکر لگاتے اور پانچ پانچ سٹار ہوٹلوں میں مہینوں قیام فرماتے ہیں، ان کا ذریعہ معاش کیا ہے؟

دوسری بات یہ ہے کہ موجودہ علماء سوء اور ائمہ مساجد کی کفالت کا ذمہ حکومت لے بھی لے، تو اُس انبوہِ عظیم کی کفالت کیسے ہو سکے گی جو ہر سال سیلاب کی طرح، مکتبوں اور دارالعلوموں سے برآمد ہوتا رہتا ہے؛ اگر ہمارے ہاں اعداد و شمار ہوتے تو دیکھنے والے دیکھتے کہ ملک کے دفاع پر شاید اتنا خرچ نہیں ہو رہا جتنا خرچ اس طبقہ پر ہو رہا ہے جو ملک کی پیداوار میں ایک پائی کا بھی اضافہ نہیں کرتا۔ اس ملک کی معیشت کبھی سنبھل نہیں سکتی جس میں جم غفیر ان لوگوں کا ہو جن کا ملک کی پیداوار میں کچھ حصہ نہ ہو۔ اور جو دوسروں کی کمائی پر مرفہ الحالی کی زندگی بسر کرتے ہوں۔ اور پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ جنہیں کچھ کام کئے بغیر، مفت کی روٹی ملتی ہو، ان کا مشغلہ اس کے سوا کیا رہ جاتا ہے جو اقبالؒ نے کہا تھا کہ

کارِ مُلّا فی سبیل اللہ فساد!

سیاسی پارٹیاں

محترمہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ملک میں سیاسی پارٹیاں نہیں ہونی چاہئیں کیونکہ ان سے افتراق اور انتشار پھیلتا ہے۔ لیکن ایسا لکھنے وقت اس کے سامنے مذہبی فرقے بھی نہیں رہتے (جنہیں وہ، جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے لعنت قرار دے چکا ہے)۔ اس باب میں اس کی کشمکش دیدنی کے قابل ہے۔ لکھا ہے:۔

سیاسی جماعتوں کے وجود کے جواز میں یہ دلیل بھی پیش کی جاتی ہے کہ اگر فقہی اختلاف، یا مذہبی فرقوں کا وجود برداشت کر لیا گیا ہے تو آخر سیاسی اختلاف اور سیاسی جماعتوں کے وجود کو کیوں ناجائز سمجھا جاتا ہے؟ ہم یہ عرض کریں گے کہ فقہی اختلاف سے مراد قرآن و سنت کی تعبیر کا اختلاف ہے۔ قرآن و سنت کے علاوہ کچھ نہیں لیکن اس اختلاف میں بھی جب عصبیت پیدا ہو جائے اور فرقہ پرستی تک نوبت پہنچ جائے تو یہ بھی کفر ہے۔ پھر ایک غلط بات کو جائز قرار دے کر اس کو دوسری غلط چیز کے لئے بنیاد قرار دے دینا کہاں تک درست ہے؟ سیاسی اختلاف ہونا ایک فطری بات ہے لیکن اس اختلاف کو عقیدہ کا رنگ دینا پھر اپنے ہم خیال لوگوں کا منظم ہونا اور پھر حصولِ اقتدار کے لئے کوشش کرنا اور پھر اسے درست سمجھنا اور اس پر اڑے رہنا ایک گمراہ کن امر ہے۔

مذہبی فرقوں اور سیاسی فرقوں میں دوسرا فرق یہ ہے کہ مذہبی قائدین نے کبھی اپنے قیاس و مسلک کو قابلِ اتباع قرار نہیں دیا کہ اس عقیدہ کو لوگ اپنا کر فرقہ بنائیں اور اگر لوگ بنا لیں تو یہ ان کی اپنی غلطی ہے جس سے قائد بیزار ہوتے ہیں۔ جبکہ سیاسی جماعتوں میں ایسی تنظیم بنانا لازمی شرط ہے۔ اور ان قائدین کا یہی مقصد ہوتا ہے۔

اور تیسرا فرق یہ ہے کہ مذہبی فرقوں کا مقصد عوام کی اکثریت کو اپنے ساتھ ملانا اور اقتدار پر قبضہ یا اس کے حصول کی کوشش کرنا نہیں ہوتا جبکہ سیاسی جماعتوں کا اصل مقصود یہی ہوتا ہے

کہ ملک میں اپنی اکثریت پیدا کرنے کے لئے نشست و انتشار پیدا کیا جائے اور پھر اس راستہ سے حکومت میں سے حصّہ رسدی حاصل کرنے کے لئے راستہ ہموار کیا جائے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اس بوکھلاہٹ پر کوئی تبصرہ نہ کرنا ہی موزوں ترین تبصرہ ہے۔ آپ نے دیکھا کہ اپنے غلط مسلک کو صحیح ثابت کرنے کے لئے انسان کس قسم کی لاطائل باتیں کرنے لگ جاتا ہے۔

(۰)

اجماعِ اُمّت

ہمارے ہاں، کسی عقیدہ، قانون یا مسلک کے "اسلامی" ہونے کی ایک دلیل یہ بھی دی جاتی ہے کہ اُمّت کا اس پر اجماع ہے۔ یہ تواتر سے ثابت ہے۔ سلف صالحین کا مسلک یہی ہے۔ وغیرہ۔ محدّث اس باب میں لکھتا ہے:

اجماعِ صحابہؓ کے حجت ہونے میں تو کسی کو کلام نہیں، لیکن مابعد کے ادوار کا اجماع کا حجت ہونا بذاتِ خود مختلف فیہ مسئلہ ہے۔ اور راجح قول یہی ہے کہ مابعد کا اجماع اُمّت کے لئے قابلِ حجت نہیں۔

صحابہؓ کا اجماع تو ثابت کیا جا سکتا ہے کیونکہ ان کا زمانہ بھی محدود اور علاقہ بھی محدود تھا۔ لیکن مابعد کا اجماع ثابت کرنا ہی بہت مشکل ہے جبکہ اُمّت اقصائے عالم میں پھیل چکی ہے اور علماء بھی ہر جگہ موجود ہیں۔ (ص ۱۹۲)

مابعد کے اختلافات کو تو چھوڑ دیجئے۔ شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی (مرحوم) نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا عنوان ہے "الانصاف فی بیان سبب الاختلاف"۔ اس کا حال ہی اردو ترجمہ "فقہی اختلافات کی اصلیت" کے نام سے، علماء اکیڈمی، محکمہ اوقاف پنجاب کی طرف سے شائع ہوا ہے۔ اس کے پہلے باب کا موضوع ہے:

فروعات میں صحابہؓ اور تابعینؒ کے اختلافات کے اسباب کا بیان۔

اس میں شاہ صاحبؒ (مرحوم) نے صحابہؓ کے اکثر اختلافات کا ذکر کیا ہے، اور لکھا ہے:

اندریں حالات صحابہؓ کے درمیان جو اختلاف کا آغاز ہوتا ہے اس کی چند بنیادیں تھیں۔ (ص)

اور پھر ان "بنیادوں" کی وضاحت کرنے کے بعد، کہا ہے:

الغرض صحابہ کرامؓ کے مذاہب مختلف ہوتے، وہ ان میں سے تابعین نے جس میں سہولت دیکھی اختیار کر لیا۔ (ص ۱۴)

لہٰذا، اجماع تو (ان تحقیقات کی رُو سے) صحابہؓ میں بھی نہیں تھا۔ اس لئے محدّث اس "اجماع" کو سند کس طرح قرار دے سکتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ اہلِ حدیث حضرات مابعد کے اجماع یا اُمّت کے تواتر اور اس کے سوادِ اعظم ہونے کو اس لئے سند تسلیم نہیں کرتے کہ وہ اس میں کوئی دینی سقم دیکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُمّت کی اکثریت ہمیشہ اہلِ فقہ کی رہی ہے۔ انہی کے مسلک کو اُمّت کا اجماع، یا تواتر، یا سوادِ اعظم کا مسلک کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اہلِ حدیث حضرات اسے سند تسلیم کر ہی نہیں سکتے۔

یاد رکھیئے! دین میں سند صرف کتاب اللہ کی ہے۔ جب تک اُمّت اس مرکز پر نہیں آئے گی اس کے اختلافات رفع نہیں ہو سکیں گے۔

(۰)

آہ بیچاری عورت!

یہ تو نہیں ہو سکتا کہ یہ حضرات "اسلامی نظام" کی بات کریں اور عورت کو فراموش کر دیں، چنانچہ محدث نے اس موضوع پر تفصیل سے لکھا ہے اور (حسبِ معمول) اس جنس مظلوم کو خوب خوب رگیدا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

اسلام مساوات مرد و زن کا ہرگز قائل نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے عورت کی شہادت کو مکمل نہیں بلکہ نصف قرار دیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

.....وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۖ فَإِن لَّمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ مِمَّن تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ..... (۲/۲۸۲)

اور اپنے میں سے دو مردوں کو گواہ بنا لیا کرو۔ اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں جن کو تم گواہ بنانا پسند کرو۔

صرف یہی نہیں بلکہ میراث میں بھی عورت کا حصّہ مرد سے نصف ہے۔ اور عبادت میں بھی عورت، مرد کے برابر نہیں۔ حیض و نفاس کے ایام میں عورت سے نماز ساقط ہو جاتی ہے۔ انہی وجوہ کی بنا پر رسول اللہؐ نے عورت کو "ناقص العقل والدین" کہا ہے۔

اور امارت و سیاست کے معاملات میں تو عورت کی شمولیت کو اسلام نے ہرگز پسند نہیں کیا۔ نہ ہی خلفائے راشدینؓ کے انتخاب میں عورت کے ووٹ کی کوئی مثال ملتی ہے۔ (ص ۱۰۳)

اس کے بعد مختلف دوائرِ حیات کا ذکر کرنے کے بعد، ملخصاً کہا ہے کہ عورت کا دائرہ کار صرف گھر کی چار دیواری ہے۔ قرآن کریم کی طرف تو ہم بعد میں آئیں گے۔ پہلے ایک دلچسپ تقابل ملاحظہ فرمایئے۔ کہا ہے کہ رسول اللہؐ نے عورت کو "ناقص العقل والدین" قرار دیا ہے۔ یعنی عقل اور دین دونوں میں ناقص۔ لیکن دو ہی ورق بعد رسول اللہ کی دو احادیث نقل کی ہیں، جن میں سے ایک میں:۔

رسول اللہؐ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تم پر ماؤں کی نافرمانی کو حرام کیا ہے۔

اور دوسری میں یہ کہ

ماؤں کے قدموں میں جنّت ہے۔ (ص ۱۰۷)

یعنی جس عورت کو رسول اللہؐ نے دین اور عقل دونوں میں ناقص قرار دیا ہے، اسی عورت کے متعلق ارشاد ہے کہ اس کی نافرمانی کو خدا نے حرام قرار دیا ہے۔ آپ اندازہ فرمایئے کہ عقل اور دین دونوں میں ناقص جنس جس قسم کے احکام دے گی، وہ عقل اور دین کے اعتبار سے کس قسم کے ہوں گے، اور جو قوم اس قسم کے احکام کی نافرمانی کو

(بحکم خداوندی) حرام سمجھے گی، اس کا مقام کیا ہوگا؟ اتنا ہی نہیں۔ اس "ناقص العقل والدین" کے متعلق فرمایا کہ اس کے قدموں میں جنت ہے! ان حضرات کے پیش کردہ اور صحیح قرار دادہ، ان ارشادات نبویؐ کی رُو سے جو لوگ جنت میں جانے کے مستحق قرار پائیں گے ان کی عقل اور دین کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے!

اب آیئے قرآن کریم کی طرف! یہ حضرات اوّل تو قرآن کریم کی طرف آتے ہی نہیں۔ اور اگر انہیں اپنی کسی مصلحت کی بنا پر مجبوراً آنا پڑتا ہے تو اس میں کھلے بندوں تحریف کرتے ہیں۔ اس آیت کو لیجئے جس کی بنا پر انہوں نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اللہ تعالےٰ نے عورت کی شہادت کو مرد کے مقابل میں نصف قرار دیا ہے۔ انہوں نے جو آیت (۲/۲۸۲) درج کی ہے وہ پوری آیت نہیں۔ انہوں نے اس کا اگلا حصّہ حذف کر دیا ہے۔ اس بقیہ حصّہ کے ساتھ آیت یوں ہے:-

وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ فَإِن لَّمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَأَتَانِ مِمَّن تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ أَن تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَىٰ ..... (۲/۲۸۲)

شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں:-

اور گواہ کر دو شاہد اپنے مردوں میں سے۔ پھر اگر نہ ہوں دو مرد، تو ایک مرد اور دو عورتیں، ان لوگوں میں سے جن کو تم پسند کرتے ہو گواہوں میں تاکہ اگر بھول جائے ان میں سے ایک تو یاد دلا دے اس کو دوسری۔

آپ قرآن کریم کی حکمتِ بالغہ پر غور کیجئے۔ اس نے صرف اتنا ہی نہیں کہا کہ اگر دو مرد نہ ملیں تو ایک مرد اور دو عورتیں بطور گواہ بلا لو۔ اس نے اس کے ساتھ یہ بھی واضح کر دیا کہ یہ دوسری عورت کس مقصد کے لئے بلائی جائے گی؟ صرف اس مقصد کے لئے کہ اگر وہ گواہ (عورت) کہیں بھول جائے تو یہ دوسری عورت اسے یاد دلا دے۔ اس سے واضح ہے کہ

(۱) پہلی عورت اگر کہیں بھول جائے تو دوسری عورت کا صرف اتنا فریضہ ہوگا کہ وہ اسے یاد دلا دے! اور بس ـــــ یہ نہیں کہا کہ اس کی جگہ یہ شہادت دینے لگ جائے۔

(۲) اگر پہلی عورت غلطی نہ کرے، تو دوسری عورت کا کوئی (FUNCTION) ہی نہیں ہوگا۔

(۳) قرآن کریم نے کہیں نہیں کہا کہ پہلی عورت کی گواہی دینے کے بعد، دوسری عورت بھی گواہی دے، اور اس طرح دو عورتوں کی گواہی مل کر ایک مرد کے برابر ہو جائے۔

ان سے پوچھئے کہ خدا نے کہاں، عورت کی شہادت کو مرد کی شہادت سے نصف قرار دیا ہے؟ غور کیجئے کہ یہ قرآن میں کھلی ہوئی تحریف ہے یا نہیں؟

اگرچہ اس نقطہ کا تعلق موضوع زیرِ نظر سے نہیں، لیکن ہم (ضمناً) یہ بھی واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ، قرآن کریم نے اس دوسری عورت کی ضرورت کیوں قرار دی ہے۔ نزولِ قرآن کریم کے وقت، عربوں نے اپنے معاشرہ میں عورت کی جو حالت بنا رکھی تھی اس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ

اَوَمَنْ يُّنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ ۝ (۴۳/۱۸)

زیورات میں پلی ہوئی اور کیفیت یہ کہ خود اپنے کیس (معاملہ) کو بھی واضح طور پر بیان کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔

اس قسم کی پرورش یافتہ عورت تو ایک طرف، آپ ہمارے زمانے کی کسی پڑھی لکھی خاتونِ خانہ کو پہلی بار کچہری میں لے جائیے اور پھر دیکھئے کہ اجنبی مردوں کے ہجوم، اور وکلاء کے سوالات کی بوچھاڑ میں اس کی حالت کیا ہوتی ہے؛ قرآن کریم نے جو کہا ہے: اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا۔ تو ضَلَّ کے معنی بھول جانا ہی نہیں (CONFUSE) ہو جانا بھی ہے۔ ایسے ماحول میں اس نوواردِ خاتون کا (CONFUSE) ہو جانا عین ممکنات میں سے ہے۔ قرآن نے اس کی اس نفسیاتی کیفیت کے لئے بطور مداوا یہ تجویز کیا کہ عدالت کے کٹہرے میں، اس کی کوئی جاننے پہچاننے والی عورت (اس کی کوئی سہیلی) اس کے ساتھ کھڑی رہے۔ اس سے اس کے اوسان بحال ہو جائیں گے۔ اور اسے اس کا اعتماد ہوگا کہ اگر اس سے کہیں کوئی تسامح ہو جائے گا تو اس کی ہم دوش اسے یاد دلا دے گی۔ یہ تھا قرآن کریم کا مقصد گواہ عورت کے ساتھ، اس کی ہم دوش کی موجودگی سے!

واضح رہے کہ قرآن کریم نے یہ کیفیت، اس ماحول میں پرورش پانے والی عورتوں کی بتائی ہے۔ یہ کہیں نہیں کہا کہ عورت، عورت ہونے کی جہت سے ناقص العقل ہوتی ہے۔ ان کی مناسب تعلیم و تربیت سے وہ زندگی کے ہر گوشے میں مردوں کے ہم دوش چلنے کے قابل ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم نے، ہر شعبۂ حیات میں مومن مردوں اور مومن عورتوں کے ہم قدم چلنے کا ذکر کیا ہے۔ (تفصیل کے لئے پرویز صاحب کی کتاب "طاہرہ کے نام خطوط" دیکھئے)

(۲) محدث نے یہ بھی لکھا ہے کہ میراث میں بھی عورت کا حصہ مرد سے نصف ہے۔ ان حضرات کی مشکل یہ ہے کہ نو، دس دس سال کے عرصہ دراز میں جس نصابِ تعلیم کے ختم ہونے پر انہیں عالم ہونے کی سند عطا ہوتی ہے، اس نصاب میں قرآن شامل نہیں ہوتا۔ سالِ آخر میں، صرف سورۃ البقرہ کی تفسیر تبرکاً پڑھا دی جاتی ہے۔ اگر قرآنِ مجید ان کی تعلیم میں شامل ہوتا تو یہ اس قسم کی غیر ذمہ دارانہ باتیں نہ کرتے کہ "میراث میں بھی عورت کا حصہ مرد سے نصف ہے"۔ ہم پوچھتے ہیں اپنے اس معاصر سے کہ کیا قرآنِ کریم کے یہ احکام بھی کبھی ان کی نظروں سے گذرے ہیں کہ

(۱) وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ ..... (۴/۱۱)

متوفی کے ترکہ میں، اس کی ماں اور باپ میں سے ہر ایک کا چھٹا حصہ ہے۔

اس میں عورت (ماں) کا حصہ مرد (باپ) کے برابر ہے۔ نصف نہیں۔

(۲) کلالہ کے ترکہ کی تقسیم کے متعلق فرمایا کہ

..... وَلَهٗ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ ..... (۴/۱۱)

اس کے بہن اور بھائی دونوں میں سے ہر ایک کا چھٹا حصہ ہے۔

اس میں عورت (بہن) کا حصہ، مرد (بھائی) کے برابر ہے۔ نصف نہیں۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ محدث کا بیان کردہ کلیہ کہ "میراث میں عورت کا حصہ مرد سے نصف

ہے۔" غلط ہے۔ قرآن میں جہاں لڑکی کا حصہ لڑکے سے نصف کہا گیا ہے، وہ لڑکی کے عورت ہونے کی جہت سے نہیں۔ اس کے مصالح اور ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

(۳) محدث نے یہ بھی کہا ہے کہ

امارت اور سیاست کے معاملات میں تو عورت کی شمولیت کو اسلام نے ہرگز پسند نہیں کیا۔ (ص ۱۰۳)

قرآنِ کریم میں سیاست و امارت (یعنی امور مملکت) کے سلسلہ میں ہے:۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ط ..... (۲۲/۴۱)

یہ (مومنین) وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم نے انہیں ملک میں حکومت عطا کی تو یہ اقامتِ صلوٰۃ۔ ایتائے زکوٰۃ۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کریں گے۔

اس سے واضح ہے کہ اسلامی حکومت کا فریضہ اقامتِ صلوٰۃ۔ ایتائے زکوٰۃ۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔ سوال یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے اس فریضۂ حکومت کو مردوں کے لئے مختص اور محدود کیا ہے یا اس میں عورتوں کو بھی شریک کیا گیا ہے۔ سورۃ التوبہ میں ہے:۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُھُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ ..... (۹/۷۱)

مومن مرد اور مومن عورتیں، ایک دوسرے کے دوست اور بہی خواہ ہیں۔ ان کا فریضہ اقامتِ صلوٰۃ۔ ایتائے زکوٰۃ۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔

آپ دیکھئے کہ، جن امور کو اسلامی حکومت کا فریضہ قرار دیا گیا ہے، ان میں مردوں اور عورتوں دونوں کو یکساں شریک کیا گیا ہے۔ غور کیجئے کہ یہ حضرات کس طرح اسلام کے نام پر خلافِ قرآن تعلیم پیش کرتے ہیں!

(۰)

رجم کی سزا

محدث نے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں جب حضرت معاذؓ بن جبل بطور سفیر رومی دربار میں گئے تو دورانِ گفتگو، بات بادشاہ کے اختیارات کے متعلق چھڑ گئی۔ آپؓ نے ان سے فرمایا:۔

تم کو اس پر ناز ہے کہ تم ایسے شاہنشاہ کی رعایا ہو جس کو تمہاری جان و مال کا اختیار ہے لیکن ہم نے جس کو اپنا بادشاہ بنا رکھا ہے وہ کسی بات میں اپنے کو ترجیح نہیں دے سکتا۔ اگر وہ زنا کرے تو اس کو درّے لگائے جائیں ..... (ص ۱۶۶)

ظاہر ہے کہ خلیفۃ المسلمین حضرت عمرؓ (جن کے متعلق بات ہو رہی تھی) شادی شدہ تھے۔ اگر شادی شدہ

زانی کی سزا رجم تھی تو حضرت معاذؓ کو یہ کہنا چاہیئے! انہوں نے دُرّوں کی سزا بتائی۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس زمانے میں شادی شدہ زانی کی سزا، کوڑے تھی۔ رجم نہیں تھی۔

(۰)

اسلام اسی کا نام نہیں!

محدّث نے معاشرتی مساوات کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ جب کسی کو عامل مقرر کرتے تو ان سے مندرجہ ذیل باتوں کا عہد لیا جاتا تھا:۔

(۱) ترکی گھوڑے پر سوار نہیں ہوگا۔
(۲) باریک کپڑے نہ پہنے گا۔
(۳) چھنا ہوا آٹا نہ کھائے گا۔
(۴) دربان نہ رکھے گا۔ ..... اہلِ حاجت کے لئے دروازے ہمیشہ کھلے رکھے گا۔

ایک بار حضرت عمرؓ، بازار میں پھر رہے تھے۔ ایک طرف سے آواز آئی کہ عمرؓ! کیا عاملوں کے لئے چند قواعد مقرر کر دینے سے تم عذابِ الٰہی سے بچ جاؤ گے؟ تم کو یہ خبر ہے کہ عیاض بن غنمؓ جو مصر کا عامل ہے باریک کپڑے پہنتا ہے اور دروازے پر دربان مقرر ہے۔

اس کے بعد لکھا ہے:۔

حضرت عمرؓ نے (حضرت) عیاضؓ کو مدینہ بلوایا۔ ان کا باریک کُرتہ اتروا کر کمبل کا کرتہ پہنایا اور بکریوں کا ایک گلہ منگوا کر حکم دیا کہ جنگل میں جا کر چراؤ۔ (ص ۱۶۲)

کس قدر صحیح کہا تھا اس کہنے والے نے کہ "اے عمرؓ! تم عاملوں کے لئے چند قواعد مقرر کر دینے سے خدا کے عذاب سے نہیں بچ سکتے"۔ اسلام ..... قواعد مقرر کر دینے اور چند قوانین نافذ کر دینے کا نام نہیں یہ تو تکریمِ آدمیت اور مساواتِ انسانیہ کے عملی نظام کا نام ہے۔ اس میں جو عامل، کمبل کا کرتہ پہن کر بکریاں چرانا نہیں جانتا، امورِ مملکت میں شرکت کا اہل نہیں ہو سکتا۔ اور جو سربراہِ مملکت، سربازار اس قسم کی تنقید، خندہ پیشانی سے نہیں سن سکتا، اور اس پر عمل کر، اور کرا نہیں سکتا، وہ مستحقِ خلافت نہیں قرار پا سکتا۔

(۰)

خریدار صاحبان! خط و کتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں تاکہ جواب میں تاخیر نہ ہو۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی لفافہ لکھیں اور پرچہ نہ ملنے کی صورت میں ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ سے پہلے اطلاع دیں۔ (ناظم ادارہ)

(۰)